دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی و اصلاحی

ماہنامہ

دارالعلوم

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر

مجید

جلد ۶ شمارہ ۴

دار العلوم دیوبند کا دینی علمی ماہنامہ

دار العلوم

ربیع الثانی سنہ ۱۳۷۲ھ مطابق جنوری سنہ ۱۹۵۳ء

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا الحاج محمد طیب صاحب مدظلہ

مدیر

ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر

رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ پندرہ تاریخ کو شائع ہوگا

چندہ سالانہ

ہندوستان و پاکستان سے پانچ روپے ۵/

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ۔ فی پرچہ ۸/

طابع و ناشر

سید محمد ازہر شاہ قیصر "یونین پرنٹنگ پریس دہلی" اردو بازار جامع مسجد

مقام اشاعت دار العلوم دیوبند

فہرستِ مضامین

مقالات

ادبیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

(سیّد محمّد ازہر شاہ قیصر)

عوام کی بے توجہی اور بد ذوقی کی وجہ سے اوّل تو علمی اور دینی رسائل کی اشاعت بہت محدود اور اُن کی مالی حالت ہمیشہ سقیم رہتی ہے اس پر مستزاد یہ کہ علمی دُنیا میں قدم قدم پر ایسی مشکلات پیش آتی ہیں، کہ کام کے راستہ پر گھپ اندھیاریاں چھا جاتی ہیں اور ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہیں دیتا، جی چاہتا ہے کہ شکوہ وشکایت کا کوئی حرف کبھی بھی زبان پر نہ آئے۔ مگر یہ صرف طبعی مذاق ہے حالات اسکی اجازت کہاں دیتے ہیں!

رسالہ "دار العلوم" کا نصف حلقۂ اشاعت، مغربی پاکستان کے دوستوں پر مشتمل ہے۔ اللہ کے فضل وکرم سے وہاں کے شہر شہر میں شروع ہی میں ایسے حضرات میسّر آگئے تھے جنہوں نے توسیع اشاعت کے لئے مسلسل جدّوجہد کی۔ لیکن اب بین الملکتی اختلافات نے حالات ایسے پیدا کر دیئے ہیں کہ ہم نے پاکستان میں دفتر رسالہ "ندائے حرم" کراچی کے ذریعے رسالہ "دار العلوم" کا چندہ جمع کرنے کا جو انتظام کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا ہے، اور اب ہم نے کافی جدّوجہد کے بعد اپنے بزرگ "مولانا محمّد صاحب انوری مہتمم مدرسہ تعلیم الاسلام، محلّہ سنت پورہ لائل پور" کو اِس پر آمادہ کیا ہے کہ موصوف ہمارے پاکستانی خریداروں سے رقوم جمع فرما لیا کریں اور مولانا نے ہماری اس درخواست کو بخوشی قبول کر لیا ہے لیکن اِس نئے انتظام کے بعد بھی ہمارے لئے یہ اشکال باقی رہ گیا ہے کہ پاکستان سے ہر پندرھویں دن اپنی رقوم کو اپنے دفتر میں وصول کر لینے کا جو انتظام کئی سال سے چل رہا تھا وہ پھر سے قائم نہیں ہو سکا ہے، مولانا موصوف سرِ دست صرف اتنا کر سکیں گے کہ پاکستانی حضرات اُنھیں ہمارے حساب میں جو رقمیں بھیجیں گے انھیں وصول فرما لیں، ہم کب تک ان رقوم کو حاصل کر سکیں گے؟ سرِ دست یہ امر بالکل نامعلوم ہے۔

کام کرنے والے حضرات جان سکتے ہیں کہ رقوم کی وصولیابی کی اس تاخیر سے ہمارے معاملات پر کتنا بُرا اثر اور ہماری ضروریات کی تکمیل میں کتنی مُشکلات پیدا ہو گئی ہوں گی۔ لیکن بایں ہمہ ہم نے اپنے عزم و حوصلے کو مایوسی اور شکست کے سُپرد نہیں کیا، دل کے جس جذبے اور دماغ کی جس یکسوئی کے ساتھ ہم ابتک کام کرتے رہے ہیں۔ حق تعالےٰ کی توفیق و ہدایت نے مساعدت کی تو ہم اِسی طرح آئندہ بھی برسرِ کار رہیں گے۔ لیکن اِس نئے ابتلا اور اشکال کے عالم میں ہمیں اپنے پاکستانی دوستوں اور ہمدردوں سے خصوصی تعاون کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ندائے حرم کراچی کے تعلق ٹوٹنے اور مولانا محمّد صاحب کے یہاں انتظام ہونے تک کے عبوری وقت میں جن پاکستانی خریداروں کو صرف وعدے پر رسالہ جاری کیا گیا ہے وہ فوری طور پر اپنا چندہ مولانا محمد صاحب کو روانہ فرمائیں۔ اُنہیں ہماری مزید کسی یاد دہانی کا انتظار نہ کرنا چاہئے۔ پاکستان کے قدیم وجدید خریدار آئندہ اپنا چندہ مولانا موصوف ہی کو بھیجیں۔ حسبِ معمول اس کی رسید نمبر خریداری کے حوالے کے ساتھ ہمارے پاس آنی چاہئے۔ ہمارے پاکستانی ہمدردوں نے کُشادہ دلی کے ساتھ اگر ہمارے ساتھ تعاون اور ہماری ان گذارشات پر عمل فرمایا، تو ہمیں اپنے موجودہ نازک حالات میں ایک حد تک سہولت حاصل ہو سکے گی۔

اِس فرصت میں ہندوستان، افریقہ اور برما کے مخلصین سے یہ عرض کرنا ہے کہ پاکستان سے رقوم کی درآمد برآمد کی ان مُشکلات نے اب رسالہ کی مالی حالت کو پُر خطر بنا دیا ہے، رسالہ کی زندگی اب صرف

دو طریقوں سے ممکن ہے۔

(۱) ہندوستان، افریقہ، برما میں ہمارے مخلصین رسالہ کی توسیعِ اشاعت کے لئے پوری جدّوجہد کریں اگر ان علاقوں میں رسالہ کا ہر خریدار ایک نیا خریدار پیدا کردے تو ہماری مشکلات بڑی حد تک ختم ہو سکتی ہیں۔

(۲) ان علاقوں کے اہلِ خیر حضرات اپنے امدادی عطیات میں اضافہ فرمائیں، امدادی رقوم ہمارے اِس نقصان کی تلافی کرسکتی ہیں جو ہمیں پاکستان کی آمدنی کے موقوف ہوجانے سے ہو رہا ہے۔

ہمارے معاونین!

(۱) جناب محمد شاہ صاحب کالونی فلور ملز لائل پور نے دو خریدار رسالہ کے لئے عنایت فرمائے ہیں۔

(۲) جناب قاسم علی صاحب ایڈوکیٹ رحیم یار خاں (بھاولپور) نے تین جدید خریداروں کا چندہ رسالہ کے لئے عنایت فرمایا ہے۔

(۳) مولانا نثار احمد صاحب نے مدھوبنی سے ایک خریدار بھیجا ہے۔

(۴) مولانا عبد الباری صاحب نے مدراس سے، چودھری فتح علی صاحب دینال نے ایبٹ آباد (پاکستان) سے ایک ایک خریدار عنایت فرمایا ہے۔

(۵) مولوی ریاض احمد صاحب فیض آبادی نے ہبلی سے ایک خریدار بھیجا ہے۔

(۶) مولوی احمد اللہ صاحب نے برن پور ضلع بردوان سے ایک خریدار کی پیش کش کی ہے۔

(۷) ہمارے بزرگ مولانا قاضی نور محمد صاحب نے قلعہ دیدار سنگھ (مغربی پنجاب) سے چھ قدیم خریداروں کا چندہ عنایت فرمایا ہے، ادارہ مولانا موصوف کی توجہات کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

(۸) جناب حافظ صدر الدین صاحب نے کمالیہ ضلع لائل پور سے دو چندے عنایت فرمائے ہیں۔

(۹) مولانا قاری عبد الکریم صاحب نے تھری جانی (سندھ) سے ایک خریدار کا چندہ بھیجا ہے۔

(۱۰) مولانا عزیز الرحمٰن صاحب نائب مہتمم مدرسہ تعلیم الاسلام لائل پور نے پانچ خریداروں کی رقم مرحمت فرمائی ہے۔

(۱۱) مولانا عرض محمد صاحب (فاضل دیوبند) نے کوئٹہ ضلع بلوچستان سے دو خریداروں کا چندہ بھیجا ہے اور رسالہ کی توسیع اشاعت کے لئے مزید سعی کا وعدہ فرمایا ہے۔

(۱۲) ہمارے کرم فرما مولانا نذیر احمد صاحب چاٹگامی نے دو خریداروں کی پیشکش کی ہے۔

(۱۳) مولانا رشید احمد صاحب (خیر المدارس ملتان) نے ایک خریدار عنایت فرمایا ہے۔

کوائفِ دار العلوم دیوبند

حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے سفر!

۱۹ر نومبر کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی مختلف انجمنوں اور اسلامی اداروں کی دعوت پر ناگپور، گنٹور، بجواڑہ، پیارم پیٹ رائے چوٹی، حیدر آباد، بمبئی کے طویل سفر پر تشریف لے گئے ناگپور سے سیٹھ محمد بشیر صاحب ممبر کارپوریشن، گنٹور سے ناظم صاحب انجمن اسلامیہ، بجواڑہ سے مولوی عبد القدوس صاحب پیارم پیٹ سے وہاں کے نیک دل تاجر حاجی فقیر محمد صاحب رائے چوٹی (مدراس) سے مولوی صبغۃ اللہ صاحب بختیاری فاضل دیوبند عرصہ سے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ سے تشریف آوری کی درخواست کر رہے تھے، دار العلوم کے مشاغل اور دوسری علمی اور دینی مصروفیتوں سے وقت نکال کر ان حضرات کی دعوتوں کو منظور کیا گیا۔ ان سب مقامات پر شاندار جلسے ہوئے، جن میں حضرت موصوف نے احکامِ خداوندی اور تعلیمات اسلامی کی تشریح فرمائی اور مسلمانوں کی موجودہ ضرورتوں کو سامنے رکھکر صحیح طریقۂ عمل کی نشاندہی فرمائی۔

الحمد للہ ان مقامات پر حضرت موصوف کے مواعظ اور بابرکت صحبتوں نے مسلمانوں میں دینداری کا شوق اور دینی زندگی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ حضرت موصوف تیئیس روز کے اس طویل سفر کے بعد ۱۱ر دسمبر کو بخیریت مراجعت فرما دیوبند ہوئے۔

ایک گرانقدر امداد!

مولٰنا موسی بھام جی فاضل دیوبند، جنوبی افریقہ میں دار العلوم کے ایک صالح فرزند ہیں جو دار العلوم سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی دار العلوم کو نہیں بھولتے اور اپنے وقتِ عزیز کا بڑا حصہ صرف فرما کر اپنے حلقۂ اثر سے دار العلوم کے لئے بڑی رقم مہیا فرماتے ہیں۔ مولٰنا موصوف نے شروع نومبر میں سید محمد ازہر شاہ قیصر مدیر رسالہ کی معرفت دس ہزار سات سو پانچ روپے کی رقم بھیجی ہے۔ جو کافی وقت صرف فرما کر مولٰنا نے جمع کی ہے۔ دار العلوم اپنے ایسے مخلص اور باعمل فرزندوں کی قیمتی امداد کا بیحد شکر گذار اور اُن کی فلاح دارین کے لئے دُعا گو ہے دار العلوم میں ختم بخاری شریف کے بعد اہلِ افریقہ کے لئے دُعا کی گئی، حق تعالیٰ قبول فرمائیں۔

بھوپال کی امداد!

اکتوبر کے رسالہ میں ہم نے لکھا تھا کہ حیدر آباد و بھوپال سے دار العلوم کو جو سالانہ وظائف ملتے تھے اُن کی مقدار بھی گھٹا دی گئی ہے اور ان کے ساتھ بہت سی شرائط کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی سعی اور خط و کتابت پر بھوپال نے غیر مشروط طور پر ۲۲۰۰ روپے کی امدادی رقم بھیجدی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ بھوپال کی یہ فرض شناسی حیدر آباد کے لئے راہبر بنے گی۔

حضرت مولٰنا سید سلیمان ندوی!

مولٰنا سید سلیمان ندوی کے انتقال پر ملال نے علم و فضل اور فکر و تحقیق کے ایک ایسے چراغ کو گل کر دیا جس کی روشنی دُور دُور تک پہونچتی تھی، سید صاحب، مولٰنا شبلی مرحوم کے مایۂ ناز شاگرد، اُن کے اسلوبِ نگارش او،

طریق تحقیق کے صحیح وارث، بہت سی قابل قدر کتابوں
کے مصنف، اپنے وقت کے بہت بڑے مفکر اور حکیم الامت
تھانوی رح کے کمالات باطنی کا ایک نمونہ تھے، ان کی شخصیت قدیم
وجدید علوم کی مرج البحرین تھی۔ علم وتحقیق کی دنیا پر ان کے قلم
اور سالہاسال کی شبانہ روز تصنیفی محنتوں کے بہت سے
ناقابل فراموش احسانات ہیں۔ افسوس ہے کہ اس نامور
مصنف اور شہرۂ آفاق عالم نے اپنے وطن سے سینکڑوں
میل دور آخرت کا سفر اختیار کیا۔

دارالعلوم دیوبند نے مولٰنا مرحوم کی جدائی کا صدمہ
پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ ۱۶ ربیع الاول سنہ ۷۳ھ کو
پہلے حضرت مولٰنا مدنی مدظلہ، نے بخاری شریف کے
درس کے بعد مولٰنا مرحوم کے لئے دعائے مغفرت فرمائی،
پھر بعد ظہر دارالعلوم میں عام تعطیل کا اعلان اور مولٰنا
مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے قرآن شریف پڑھا گیا
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالمصنفین اعظم گڑھ
اور حضرت مولٰنا کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ظاہر
کرتا ہے۔

امدادی عطیات!

(۱) مسلمانان کھلوڑ ضلع سورت کی طرف سے
مرسلہ حاجی اسماعیل دیندار صاحب۔ ۷۰۰
(۲) ایم، ایس، نولاکھی از جوہانسبرگ،
جنوبی افریقہ۔ ۳ پاؤنڈ
(۳) ایس احمد جال اینڈ کو کلکتہ۔ ۲۰۰ (بہ زکوٰۃ)
(۴) حاجی احمد موسی جی سالوسی جی (افریقہ) ۳۳۰ (")
(۵) ہندسی بی درکس مئوناتھ بھنجن اعظم گڑھ کی طرف سے
سو روپے سالانہ کی ادویات۔
(۶) امین اینڈ اسماعیل انگریزی دواخانہ کلکتہ کی طرف سے بھی
سو روپے سالانہ کی ادویات۔

فلسفۂ نعمت و مصیبت

(حضرت مولٰنا محمد طیب صاحب مدظلہ)

یہ متفاوت خصوصیات تو مابہ الربط بن نہیں سکتیں کہ ان متفاوت الاحوال اشیاء میں وابستگی پیدا کردیں۔ کیوں کہ مختلف اشیاء میں وابستگی اور جوڑ کسی قدر مشترک سے ہوتا ہے نہ کہ قدر مخصوص سے۔ پس یہ وابستگی بغیر کسی ایسے درمیانی رشتہ کے ناممکن ہے کہ جو غیر محسوس طریق پر ان سب اشیاء کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہو اور ایک کو دوسرے سے وہ اتنا ہی قریب کرسکتا ہو جتنا کہ وہ مخصوص نوعیتوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بعید ہیں۔ ظاہر ہے کہ تکوینی اشیاء میں وہ رشتہ یا مابہ الربط اُن کے وجود کے سوا دوسری چیز نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ عدم میں تو یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ ان اشیاء کو باہم جوڑ دیتا۔ چنانچہ جب یہ اشیاء موجود نہ تھیں تو کسی کا کسی سے کوئی بھی رشتہ اور جوڑ نہ تھا اور ایسے ہی وجود چھن جانے یا موت کے بعد بھی معدوم کا کسی سے کوئی علاقہ باقی نہیں رہتا۔ موجودگی کے بعد ہی اشتراک اور قرب و وصل باہمی قائم ہوا، اور ظاہر ہے کہ موجودگی سے کسی موجود میں سوائے وجود کے اور کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا جس سے علاقے اور روابط کی بنیاد پڑ جاتی ہے، تو صاف کھل گیا کہ وجود ہی ایک ایسا ہمہ گیر رشتہ ہے جس کی بدولت ایک کا دوسرے سے تعلق باہمی جذب و کشش اور ربط و ضبط وغیرہ قائم ہوتا ہے۔

لیکن یہ صورتِ حال جب ہی ممکن ہے کہ وجود سب اشیاء کا ایک ہو۔ اگر ہر ایک کا وجود الگ الگ ہو تو اشیاء کے تعدد کے ساتھ اُن کا وہی تفرق پھر بھی باقی رہے گا جو موجودگی سے پہلے تھا کہ کسی چیز کا کسی سے واسطہ اور ربط نہ تھا۔ اور ربط باہمی کیلئے وجود سے اوپر پھر کوئی اور ہمہ گیر اور عام رشتہ تلاش کرنا پڑے گا۔ مگر وجود سے زیادہ عام کوئی بھی دوسری کلی نہیں جو ساری موجودات پر حاوی ہوجائے۔ پس ادھر تو ایک کا دوسرے سے واسطہ ہی نہیں بلکہ ایک کے آثار تک کا دوسرے تک پہونچنا بدیہی اور مشاہد ہے اور ادھر وجود سے اعم کوئی اور رشتہ نہیں جو اس ایصال و وصول اثرات کا کام انجام دے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ کائنات کی اشیاء متعدد سہی مگر وجود سب کا واحد ہے جس نے ایک کو دوسرے سے جوڑ رکھا ہے، ایک کے منافع دوسرے تک، ایک کے مضار دوسرے تک اور ایک کے آثار و احوال دوسرے تک بعینہٖ اسی طرح پہونچا رکھے ہیں جیسے پورے حوض کے پانی میں جو ایک ہوتا ہے۔ اگر ایک سمت میں پانی کو حرکت ہوتی ہے تو پانی کی وحدت اور بساطت کے سبب اس کی متحرک لہریں دوسری سمت تک بھی اوس حرکت کو پہونچا دیتی ہیں۔ اور اگر کہیں دریا کا مرکزی حصہ اور وہ بھی اپنے اندرونی جوش سے حرکت میں آجائے تو پھر تو پورے دریا میں تلاطم برپا ہوجانا ایک امر طبعی ہے۔ اسی طرح اگر دریائے وجود کا مرکزی نقطہ حرکت میں آجائے تو پوری کائنات پر جو سلسلۂ وجود میں جکڑی ہوئی ہے اس حرکت کا کم و بیش اثر پڑنا لازمی ہوگا۔

عطائے وجود کا مرکزی نقطہ اور حقیقت جامعہ انسان ہے

غور کرو تو ان واحد الوجود موجودات میں وجود کا مرکزی نقطہ صرف انسان ہے۔ کیوں کہ مرکز کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ محیط میں پھیلی ہوئی تمام قوتوں کا جامع ہو اور محیط تک جو کچھ بھی اثرات پھیلے ہوئے ہوں وہ مرکز ہی کے ہوں اور وہی سارے کرہ کے حق میں چشمۂ فیض ہو۔ اور اگر محیط سے اثرات سمٹ کر لوٹیں تو وہ بھی مرکز ہی کی طرف لوٹیں۔ گویا مرکز سے انبساطی (پھیلتی ہوئی) حرکت ہو تو اثرات محیط تک

پھیل جائیں اور اُس کی انقباضی (سُکڑتی ہوئی) حرکت ہو تو سارے اثرات محیط سے پھر کر مرکز کی طرف لوٹ آئیں یعنی اثرات کے لئے وہی مرکز مبداء ہو اور وہی پھر مرجع ہو جیسے حق تعالیٰ شانہٗ مرکزِ وجود ہے تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ وجود کا آغاز بھی وہیں سے ہے اور انجام بھی اُسی کی طرف ہے، وہیں سے وجود پھیلتا ہے اور سب میں سے سمٹ کر بالآخر اُسی کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

غرض مرکز اپنے کُرہ اور اُس کے محیط کے تمام اثرات و احوال کے لئے نقطۂ فیض اور حقیقتِ جامعہ بھی ہوتا ہے کہ کُرہ کے تمام احوال اپنے اندر لئے ہوئے ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ حقیقتِ راسخہ بھی ہوتا ہے کہ پُورے کُرہ میں اپنے اثرات کے راستے سے گھُسا ہوا بھی ہوتا ہے، بالفاظِ دیگر محیط تو مرکز میں سمٹا ہوا ہوتا ہے اور مرکز محیط میں پھیلا ہوا ہوتا ہے کار فرمائی دونوں صورتوں میں مرکز ہی کی ہوتی ہے خواہ وہ پھیل جائے جس سے دائرہ بن جائے اور خواہ وہ سُکڑ جائے جس سے دائرہ سمٹ آئے اور صرف مرکز ہی مرکز کا ظہور رہ جائے۔ غور کرو تو انسان کو پُوری کائنات سے وہی نسبت حاصل ہے جو مرکز کو محیط سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ انسان پُوری کائنات کی حقیقتِ جامعہ بھی ہے کہ اُس میں ساری کائنات سمائی ہوئی ہے اور حقیقتِ راسخہ بھی ہے کہ وہ خود ساری کائنات میں سمایا ہوا ہے۔

انسان کا علمی احاطہ اگر علم کے لحاظ سے لو تو بحر و بر، اور ارض و سما کی ساری کائنات علماً اُس میں سمائی ہوئی ہے، کیوں کہ ہر ہر چیز کے اسماء اُس کے خزانۂ علم میں محفوظ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تمیز بین الاشیاء یعنی علم کا اولین مرتبہ علمِ اسماء ہے، جسے قرآنِ حکیم نے بایں عنوان واضح فرمایا:۔

وعلّم آدم الاسماءَ كلّها۔ "اور سکھلا دئے آدم کو تمام چیزوں کے نام"

جس سے واضح ہے کہ ہر چیز اپنے نام کے لحاظ سے انسان کے اندر اُتری ہوئی ہے۔

انسان کا تصوّری احاطہ پھر تصوّر اور استحضارِ ذہنی کے لحاظ سے لو تو کائنات کی ہر چیز کے نقشے اور صور و امثال بھی اُس کے ذہن میں سمائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے فکر و تصوّر کی طاقت سے بحر و بر، ارض و سماء، شجر و حجر، نبات و حیوان وغیرہ جس چیز کو بھی ایکبار دیکھ پاتا ہے (اور سب ہی چیزوں کو نوعِ انسانی ہمہ وقت دیکھتی ہی رہتی ہے) تو اُن کے نقشے اور صورتیں اُسی حجم و ضخامت اور طول و عرض کے ساتھ اُس کے آئینۂ ذہن میں مرتسم اور منتقش ہو جاتے ہیں، گویا ساری کائنات اسمًا و رسمًا اور صورتًا و تمثالاً اُس کے اندر پڑی ہوئی ہے۔ جس کو قرآنِ حکیم نے اِن الفاظ میں واضح فرمایا ہے:۔

سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتّی یتبیّن لھم انّہ الحق۔ "ہم عنقریب دکھلائیں گے اُنھیں اپنی نشانیاں بیرونی جہانوں اور خود اُن کے اندرون میں۔ تاکہ اُن پر واضح ہو جائے کہ وہی حق ہے۔"

پھر جہاں وہ اپنے ذہنی تصوّر سے کائنات کی رسوم و اشکال پر حاوی ہے وہیں اپنے قلبی علوم سے اُس کے حقائق و معارف اور اسرار بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور یعلم السرّ واخفی کا مظہرِ اتم بنا ہوا ہے جس سے اُس کے علمی احاطے کا کائنات کے اجزاء و اعیان پر ثابت ہوتا ہے جس کے یہ مختلف پہلو ہیں۔

انسان کا حِسیاتی احاطہ پھر یہی نہیں بلکہ حسیات اور کائنات کے اشخاص و اعیان کے لحاظ سے دیکھو تو ساری ہی انواعِ کائنات کے حسّی نمونے اپنے مادّی و رُوحانی اجزاء سمیت بذاتہٖ بھی اُس میں بھرے ہوتے ہیں۔ محسُوسات کو لو تو جماد کی جمادیت، معادن کی معدنیت، نبات کی نباتیت، حیوان کی حیوانیت اُس میں موجود ہے۔ حقائق کو لو تو ملائکہ کی ملکیت، شیاطین کی شیطنت، بہائم کی بہیمیت اور درندوں کی سبُعیت اُس میں موجود ہے۔ مغیبات کو لو تو رجالِ غیب کی ساری شانیں۔ عبدیت و اطاعۃ۔ عصمت و عفۃ، توجہ و ہمّت، عشق و محبّت، جذب و طلب، افادہ و استفادہ، انکسار و تواضع وغیرہ سب اُس میں بھری ہوئی ہیں۔ حتیٰ کہ اگر صفاتِ الٰہیہ، اور

شئون ربانی کے لحاظ سے دیکھو تو اُن کے نمونے بھی اس میں سب کے سب موجود ہیں۔ علم و قدرت، نظم و انتظام، حکومت و سلطنت تسخیر و تدبیر، تصویر و تنقیش، افناء و ابقاء، تعمیر و تخریب، ایجاد و تکوین، اقار و تحفظ، رحمت و شفقت، جود و کرم، احسان و انعام، مواخذہ و انتقام، عفو و درگذر۔ غرض علوم و اخلاق اور اسماء و افعال الہیہ کا مظہر اتم بھی یہی انسان ہے۔ گویا حسّاً اور عیناً، اسماء و صفات خداوندی بھی اُس میں رچی ہوئی ہیں۔ جس کی تعبیر لسان نبوی سے ان الفاظ میں کرائی گئی کہ:۔

خَلَقَ اللّٰہُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ "اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا"

صورت چونکہ ظہور حقائق کا نام ہے، اس لئے مطلب یہ ہو گا کہ اللہ نے انسان کی صورت میں اپنے حقائق و کمالات کو نمایاں کیا ہے۔

انسان حقیقۃ راسخہ اور حقیقۃ فائقہ بھی ہے

پھر یہی نہیں کہ انسان میں سارے علوی و سفلی جہان سمائے ہوتے ہیں بلکہ خود یہ انسان بھی اس علم و اخلاق کی طاقت کی بدولت ان جہانوں میں سمایا ہوا ہے کیوں کہ وہ مرکز کائنات ہے۔ اور ہم ثابت کر چکے ہیں کہ مرکز جامع ہوتا ہے تمام افعال و صفات دائرے کا۔ اور نہ صرف جامع ہی ہے بلکہ اشیاء کائنات کے ان نمونوں میں جو اُس میں سمائے ہوئے ہیں وہ ان اصل اشیاء سے بھی چار ہاتھ آگے اور بڑھا ہوا ہے۔ یعنی یہ اشیاء اگر ایک حد تک اپنے خواص و آثار دکھلاتی ہیں تو یہ انسان وہی خواص و آثار اُس سے کہیں بڑھ چڑھ کر دکھلاتا ہے۔

جماد تو صرف اپنی طبعی اُفتاد سے جمادیت دکھلاتا ہے کہ کسی پر بلاشعور گر پڑے یا اتفاق سے لگ جائے تو اُسے چوٹ پہونچائے مگر یہ عقلی انداز سے جب جمادیت پر آ کر کسی کو لگنے اور چوٹ پہونچانے کے نئے نئے ڈھنگ پیش کرتا ہے تو جماد لایعقل سے کہیں بڑھ کر جماد ثابت ہوتا ہے۔ بہائم تو اپنی طبیعت ہی سے بہیمیت پر آتے ہیں، اور اُن کی بہیمیت خاص خاص مقررہ افعال تک محدود رہجاتی ہے، مگر یہ عقل و علم کے تحت جب بہیمیت پر آتا ہے تو بہیمیت کی ایسی ایسی صورتیں پیدا کرتا ہے کہ بہائم کے وہم و خیال میں بھی نہیں آتیں، اس لئے بہیمیت میں بہائم سے کہیں آگے نکل جاتا ہے۔ ملائکہ تو طبعی ہی شان سے عبادۃ الٰہی کے مقررہ وظائف ادا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ علمی اور عقلی شان سے جب عبادۃ کی اوضاع پر آتا ہے تو اپنے فکر و اجتہاد سے عبادۃ کے وہ نئے سے نئے نمونے دکھلاتا ہے کہ ملائکہ بھی پیچھے رہجاتے ہیں۔ شیطان تو طبعی ہی انداز سے کفر و اغوا کی مقررہ حرکات کرتا رہتا ہے لیکن یہ شیطنت کو جب علم و عقل کے پردوں میں اُصول کا نام لیکر نمایاں کرتا ہے تو اُس کی بے پناہ چالاکی اور مکاری کے سامنے شیاطین بھی گرد ہو جاتے ہیں۔ غرض اس میں کائنات کا ہر جزو اور پھر ہر جزو کی ساری خاصیتیں عیناً موجود ہی نہیں بلکہ اُن سے بڑھ چڑھ کر موجود ہیں۔

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ؟ "اور موجود ہیں خود تمہارے نفوس میں کیا تم پھر بھی نہیں دیکھتے؟"

یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو یہ انسان ان اشیاء کائنات میں کھود کرید کر کے اُن کے حقائق اور خاصیات کے بارے میں علمی طور پر وہ وہ نظریات قائم کرتا ہے کہ خود ان اشیاء کو اپنی ہی ان حقائق پر مطلع ہونے کی کوئی استعداد نہیں۔ اور دوسری طرف وہ ان اشیاء میں اپنے کسب، ریاضت اور تمرین و تجربے سے عملی طور پر تصرفات کر کے وہ وہ ایجادیں کرتا اور اُن کی قوتوں سے وہ وہ کام لیتا ہے کہ از خود یہ اشیاء وہ کام نہیں کر سکتیں، گویا یہ اشیاء سے کام لینے والا ہے، اشیاء کے کام آنے والا نہیں ہے۔ پس جس طرح یہ اشیاء انسان کے اندر علماً و عملاً گھسی ہوئی ہیں اُن سے کہیں زیادہ یہ انسان خود اُن کے اندر گھسا ہوا ہے۔ گویا ان تمام اشیاء کائنات کے نفوس تو اسکی مدد پر کھڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جماد و نبات اور حیوانات کے کچھ نفوس تو غذا و دوا بن کر اس کے نفس کو مدد دیتے ہیں اور اُس کے نفس میں سما جاتے ہیں۔ کچھ نفوس لباس بنکر اُس کے نفس کو بیرونی عوارض سردی، گرمی سے محفوظ رکھ کر مدد دیتے ہیں، کچھ نفوس مکان کی صورت سے اُسکے نفس کو مدد پہونچاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرض ہزاروں انداز سے کائنات کی ہر چیز اپنے نفس کو انسانی نفس پر فدا کرتی رہتی ہے اور یہ غذا بنی ہوئی ہے جس سے پلکر اور پروان چڑھ کر

وہ فکر و نظر اور صنع و عمل کے قابل ہوتا ہے۔ اور انسان اپنے جامع نفس سے ان اشیاء کے نفوس کو مدد پہونچا رہا ہے جس سے اُن کے مکنون جوہر کھلتے ہیں۔ ورنہ انسانی تصرف نہ ہو تو ہر شئے کی خاصیت پردۂ عدم میں مستور پڑی رہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی شئے کو اپنی خاصیات دکھلا کر اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے مقام پر لا کھڑا کرنا اور اُس کے جوہروں کو اُس سے اُگلوا لینا جس سے وہ زندہ ثابت ہو۔ بلاشبہ اُس کے نفس کو مدد پہونچانا اور اُسے زندہ دکھلانا ہے۔ اِس طرح جانبین سے تاثیر و تاثر کا سلسلہ قائم ہے۔

اِس سے واضح ہے کہ اِس کائنات میں وجود کے لحاظ سے انسان نہ صرف حقیقۃً جامع ہی ہے کہ ساری کائنات کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ بلکہ حقیقۃً راسخ بھی ہے کہ یہ خود بھی پُورا کا پُورا کائنات میں سمایا ہوا ہے۔ ع "چوں آئینہ بدستِ من و من در آئینہ"

وحدۃ الوجود سے وحدۃ العدم

اِس سے جہاں یہ نمایاں ہوتا ہے کہ انسان سے لے کر پوری کائنات تک وجود کا سلسلہ ایک ہی ہے جس میں کوئی تجزیہ نہیں اور وجود کا مرکزی اور جامع نقطہ انسان ہے۔ ایسے ہی یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ساری کائنات کا عدم بھی ایک ہی ہے۔ کیونکہ جس رنگ کی اصل ہوتی ہے اُسی رنگ کی اُس کی عدمی ضد بھی ہوتی ہے۔ نور کے پھیلاؤ کا جو انداز ہے وہی ظلمۃ کا بھی ہے فرق صرف وجود و عدم کا ہے، ایک نور ہے ایک عدم النور۔ دن جس انداز پر کائنات پر چھاتا ہے اُسی انداز سے اُس پر رات بھی چھاتی ہے، فرق وہی نور و ظلمۃ اور وجود و عدم کا ہے، کہ ایک یوم ہے ایک عدم الیوم۔ پس اگر کائنات کا وجود ایک ہے جس کے پرتوے سب پر پڑے ہوئے ہیں تو عدم بھی ایک ہی ہے جس کی تاریکی جلتوں میں پھیلی ہوئی ہے کیونکہ وجود اُنہی اُنہی گوشوں میں تو آیا ہے جنہیں وہ نہیں تھا یعنی اُن کا عدم تھا۔ اگر اُن جگہوں میں اُس کا عدم نہ ہوتا، بلکہ پہلے ہی سے وہ خود ہوتا تو پھر وجود کو آنے کی کیا ضرورت تھی کہ تحصیل حاصل ہوتی جو محال ہے۔ پس وجود آنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ پہلے سے نہ تھا اور جب نہ تھا تو عدم تھا۔ اِس لئے جہاں جہاں عدم تھا اور جس انداز سے تھا وہ ساری کائنات میں تھا اور یکساں تھا تو وہیں وہیں وجود آیا، اور یکسانی کے ساتھ آیا۔ اِس لئے اُس کا انداز قُدرتی طور پر وہی ہونا چاہیے تھا جو عدم کا تھا۔ گویا وجود کے استیلا کا طور و طریق عدم کے استیلاء کے طور و طریق کا نمونہ ہے۔ اور یہ واضح ہو چکا ہے کہ وجود سب کا ایک ہے، اور روشنی کی طرح موجود شدہ کائنات پر چھایا ہوا ہے اِس لئے یہ بھی واضح ہو گیا کہ عدم بھی ساری کائنات کا ایک ہی ہے جو ظلمۃ کی طرح اُس میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

رہیں یہ صورتوں اور شکلوں یا اندرونی خصلتوں اور سیرتوں کی خصوصیات اور تقطیعات جن سے بادی النظر میں ہر شئے کا وجود دوسری سے الگ دِکھائی دیتا ہے تو یہ نہ وجود کی تقطیعات ہیں نہ عدم کی۔ بلکہ وجود و عدم کے جمع ہو جانے کی حد بندیاں اور اُن سے نمایاں شدہ نقشوں اور خاص خاص ہیئتوں کی ایک نمود ہے جس کی اصلیت کچھ نہیں۔ محض ظواہر کے نظر کے لحاظ سے منظر کی ایک قطع برید ہے جس سے نہ وجود کی وحدۃ میں فرق پڑتا ہے نہ عدم کی ایکی میں جیسے دھوپ کے ٹکڑے مربع یا مثلث نظر آتے ہیں یا سایہ کے ٹکڑے، اِسی طرح متشکل ہو کر محسوس ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ نہ یہ نُورِ آفتاب کا تجزیہ اور تقطیع ہے کہ ہم اُسے منقسم کر کے اُس کے ٹکڑے الگ الگ کر دیں اور قبضا لیں اور نہ سایہ کے ٹکڑے ہیں جن کو ایک دوسرے سے جُدا کیا جا سکے۔ بلکہ جہاں نور کے ساتھ عدم النور کا تزاحُم ہوا ہے وہاں موقع کی وضعیت کے لحاظ سے نُور و ظلمت کے مجموعہ اور مرکب کی ایک ہیئۃ کذائی پیدا ہو گئی ہے جسے شکل کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شکل نہ اصل میں دھوپ کی ہے نہ سایہ کی ہے نہ آفتاب میں تھی نہ اُس کے سایہ میں کہ وہ دونوں اپنی ذات سے غیر متشکل اور واحد ہیں۔ یہ صرف دونوں کے مقام اتصال پر نُور و ظلمت کے ٹکراؤ کی ایک تکوینی ہیئۃ ہے جو بادی النظر میں خود نور و ظلمت کی ہیئۃ محسوس ہوتی ہے ورنہ بلحاظ حقیقت یہ نُور و ظلمت کی ہیئت نہیں اُن کے ٹکراؤ کی ہیئۃ ہے جس سے خود نور و ظلمت بالاتر ہیں۔ یہی حال وجود و عدم کا بھی ہے کہ نہ وجود میں تقطیع اور تشکل ہے نہ عدم میں۔ بلکہ ان دونوں کے مقام اجتماع یعنی ممکنات استعدادوں پر ٹکراؤ اور وجود کی جلوہ گری سے معدوم ممکنات کی یہ شکلیں نمایاں ہوئیں۔ جس میں اصلی عدم اور عارضی وجود کے ٹکراؤ سے

حدبندی کا ایک نقشہ پیدا ہو گیا سو یہ حدبندی نہ وجود کی ہے نہ عدم کی بلکہ اس شکل کی ہے جس پر وجود و عدم کا ٹکراؤ ہوا گو ظاہر میں وجود و عدم محدود نظر آتے ہوں مگر یہ تجزیہ اس شکل کا اور اس کی محدود نوعی استعداد کا ہے نہ کہ وجود یا عدم کا

بہر حال وجود بھی ایک ہے اور عدم بھی ایک۔ اور کائنات کی ہر جزئی میں تقابل کے ساتھ دونوں اثر انداز ہیں۔ اس لئے کائنات کا ہر جزو وجود سے بھی متعلق ہے کہ وجود کا حصہ اُس میں قایم ہے اور عدم سے بھی متعلق ہے کہ اُس کا حصہ پہلے ہی سے اُس میں قایم ہے گویا پوری کائنات میں کو وجود کا رشتہ بھی نکلا ہوا ہے اور عدم کا بھی اس لئے جب کسی جزئی کے وجود کو حرکت ہوگی او خصوص انسان کے وجود کو جو وجود کا مرکزی نقطہ ہے تو اصل وجود منشرح ہوگا اور انبساط میں آجائے گا اور اُس کی وحدۃ سے تمام موجودات تک اُس انشراح و انبساط کا اثر پھیلتا چلا جائے گا اور ہر ہر چیز میں بقدر استعداد وجودی خیر و برکت نمایاں ہوتی چلی جائے گی، اور جب کسی بھی جزئی اور خصوص انسان کا عدمی حصہ حرکت میں آئے گا جو عجب نہیں کہ عدم کا بھی مرکزی نقطہ ہے کیوں کہ عطائی وجود کا یہی مرکزی نقطہ ہے تو اصل عدم میں انبساط ہوگا اور اُس کی وحدۃ سے تمام موجودات کے عدمی حصوں تک اُس انبساط کا اثر پہونچے گا اور ہر ہر جزئی کے عدم میں بوجہ وحدۃ عدم عدمی آفات و شرور کے حصے پیدا ہو کر ابل پڑیں گے اور مرکز کی آفت سے پورا محیط درجہ بدرجہ آفت زدہ ہوگا۔

غرض یہ وجودی اور عدمی حرکتیں بوجہ وحدۃ وجود و عدم مرکز سے محیط تک اور محیط سے لوٹ کر پھر مرکز تک آئیں گی وجودی حرکت عدل و اعتدال کی حرکت ہوگی جو انسان کی فطرۃ سلیم سے مزید افعال طبعی و عقلی و شرعی ابھرے گی اور عدمی یا سلبی حرکت بے اعتدالی کی حرکت ہوگی جو اُس کے عدمی الاصل نفس بصورت افراط و تفریط و جہالت ابھرے گی۔

پس جیسے دریا کے مرکزی حصے اور اصل قعر اور گہرائی میں اگر وجودی اور معتدل حرکت ہوگی تو چوں کہ وہی وجود سارے دریا کا بھی ہے، اس لئے وہی اعتدال پورے دریا کی حرکت میں ہوگا، لہریں طوفانی نہ ہوں گی قاعدے کی حرکت ہوگی تو نہ دریا کے خزانے اُلٹ پلٹ ہوں گے نہ دریائی مخلوقات تہ و بالا ہوگی۔ لیکن اگر مرکز سے غیر معتدل یا عدم اعتدال کی حرکت ہو یعنی عدم حرکت کرے جس سے وہ قاعدے کی حرکت مٹ جائے تو یہی عدم الاعتدال جو پورے دریا میں ایک تھا بلاشبہ ابھر آئے گا اور وہ طوفان بپا ہوگا کہ سارے دریائی خزانے اِدھر کے اُدھر اور اُس کے جانور یہاں کے وہاں، اور وہاں کے یہاں ہو جائیں گے، نہ قعر دریا کا نظام درست رہے گا کہ خزائن اپنی اپنی جگہ رہ سکیں بحری مخلوق اپنے اپنے مستقر پر قائم رہ سکے اور غوطہ زن غوطہ لگا سکیں اور نہ سطح دریا ہی کا نظم قائم رہے گا کہ کشتیاں چل سکیں، شکار ہو سکے اور موتی برآمد کئے جا سکیں۔

پس انسان جبکہ وجود بھی وہی رکھتا ہے جو پوری کائنات میں پھیلا ہوا ہے اور عدم بھی اُس میں وہی ہے جو پوری کائنات میں ہے اور پھر اُوپر سے یہ وجود و عدم دونوں ہی کا مرکزی نقطہ بھی ہے کہ یہ موجود ہو تو اُس کی ضرورت سے عالم بھی موجود ہو یہ نہ ہو تو اُس کی بھی ضرورت نہ ہو۔ نیز بعد موجودگی جب بھی اُس سے اثرات اُبھریں تو کائنات تک جائیں اور کائنات سے اُٹھیں تو اُس تک آئیں تو قدرتی بات ہے کہ جب یہ اپنے علم و اخلاق کے معتدل افعال سے عدل کی حرکت کرے گا تو اس وحدۃ الوجود سے پوری کائنات کا وجود منبسط اور منشرح ہوگا اور اوس سے معتدل ہی آثار اُبھریں گے جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ اور جزئی جزئی مخلوق نعمت و راحت اور انبساط و نشاط میں آجائے گی۔ (باقی باقی)

دوسری قسط :-

اسلام میں حکومت کا درجہ!

(از مولٰنا حکیم محمد اسحاق صاحب استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ)

تیسری دلیل یہ کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ ایک مخصوص نوع کی دلیل کا مطالبہ ہے۔ لیکن کیا یہ مطالبہ جائز ہے؟ کیا دین کے ہر حکم کا قرآن مجید میں منصوص ہونا ضروری ہے اگر کسی مسئلہ کے متعلق قرآن مجید میں نص موجود نہ ہو تو کیا اس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ دین سے خارج ہے؟ ان سب سوالات کا جواب اگر نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو یہ بات بھی یقینی ہے کہ یہ مطالبہ بالکل ناجائز ہے۔

(۱) کلام ربانی کے اولین مخاطب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اور صحابہ کرام ہیں۔ ان پر دو دور گذرے ہیں، پہلا دور مکی زندگی کا، اس میں اقامتِ حکومت کی استطاعت نہ تھی۔ دوسرا دور مدنی زندگی کا، اس میں حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اس لئے اس کے لئے کوئی صریح حکم دینے کے معنی تحصیل حاصل کے تھے۔

(۲) حکومت کا قائم کرنا اجتماعی زندگی کی فطرت کا خاصہ ہے اس کے لئے کسی حکم کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح قرآن مجید میں اس کا حکم نہیں ہے کہ جاڑوں میں گرم کپڑے پہنو، اسی طرح اقامتِ حکومت کا حکم بھی نہیں ہے۔ اصل ضرورت اس کے احکام واصول بیان کرنے کی تھی۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان مسائل پر کافی روشنی ڈالی ہے اور احادیث نبویہ نے مزید تشریح و تفصیل کر دی ہے۔ اس جواب کی ضرورت تو اس وقت ہے جب تسلیم کر لیا جائے کہ یہ حکم نص قرآنی سے ثابت نہیں ہے۔ لیکن واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے، نصوص قرآنیہ سے یہ مسئلہ صاف طریقے سے ثابت ہے۔

ان حضرات سے ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ نص کا مفہوم ان کے نزدیک کیا ہے؟ آیا محض عبارۃ النص یا وہ مفہوم جو اسے نیز اشارۃ النص، دلالۃ النص، اور اقتضاء النص سب کو شامل ہے؟ اگر صرف عبارۃ النص مراد ہے تو اس تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ جبکہ فقہاء کرام اس کی صراحت کرتے ہیں کہ کسی حکم کو ثابت کرنے کے لئے ان چاروں کی قوت بالکل یکساں ہے۔ اور ان سب کا شمار دلائل قطعیہ میں ہے۔ البتہ تعارض کے وقت بعض کو بعض پر ترجیح دی جائے گی۔ ہمیں تسلیم ہے کہ قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت ہمیں نہیں ملتی ہے جس کا ترجمہ "حکومت قائم کرو" کیا جا سکے۔ لیکن اگر اتنی سی ناکامی اس فریضہ کو دین سے خارج کر سکتی ہے، تو نماز جمعہ کی فرضیت اور اس کے داخلِ دین ہونے کی کیا دلیل رہ جائے گی؟ پورے قرآن مجید کو دیکھ جائیے کہیں آپ کو ایسی آیت نہ ملے گی جس کا ترجمہ آپ "نماز جمعہ قائم کرو" کر سکیں۔ یہی نہیں بلکہ فقہ کا بہت سا حصہ جو نص کی دوسری قسموں سے ثابت ہے دین سے خارج ہو جائے گا۔

لیکن اگر نص کا وہ عام مفہوم مراد ہے جو کل اقسامِ نص کو شامل ہے تو ہمارا دعویٰ ہے کہ اقامتِ حکومت کا حکم نصِ قرآنی سے ثابت ہے۔ آئندہ سطروں میں جب ہم اس مسئلہ پر مسلک حق کے دلائل بیان کریں گے تو مسئلہ کا یہ پہلو انشاء اللہ بالکل واضح کر دیں گے۔

چوتھی دلیل دلیل کا بنیادی مقدمہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے اقامتِ حکومت کو اگر ایک دینی و شرعی حکم تسلیم کر لیا جائے تو اس کے کیا معنی ہیں کہ اس حکم کا مخاطب ہونے کے بعد نافرمانی کرنے کی سزا، حق تعالیٰ سے دوری اور

ان کی ناراضگی کی صورت میں ظاہر ہو؟ اِس مقدمہ کی صداقت تو خود اس کی محتاج ہے کہ پہلے اقامتِ حکومت کو ایک غیر دینی چیز مان لیا جائے۔

بلاشبہ اگر کسی شخص پر (اِن شرائط کے ماتحت جو اس حکم کی فرضیت کے لئے شریعت اسلامیہ نے مقرر کئے ہیں) اقامتِ حکومت کا فریضہ عائد ہوتا ہو اور وہ اس کی ادائیگی سے پہلو تہی کرے تو اُسے حق تعالےٰ سے بعد ہوگا، اس کی ترقی باطنی رُک جائے گی۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ کہیں اس کے بہتیرے اعمال صالحہ ضبط نہ ہوجائیں اِس لئے کہ اس نے وقت کے حکم سے روگردانی کی ہے۔ بنو اسرائیل کا معاملہ ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے "اریحاؔ" میں داخل ہوکر اس فریضہ کی ادائیگی سے اِنکار کر دیا۔ قرآن مجید کا بیان ہے اس نافرمانی کی سزا میں انھیں چالیس سال تک سرگردان رکھا گیا۔ اور کتاب مبین نے انھیں اِسی جُرم پر "فاسق" کا لقب دیا ہے، اس لقب اور سزا سے انھیں نہ انکی نماز بچاسکی نہ روزہ۔ اس کے بعد یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حکومت قائم نہ کرنے سے اللہ تعالےٰ سے تعلق میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور قربِ حق اس پر موقوف نہیں ہے۔

قرآن مجید ہی کا ایک دوسرا بیان بھی اِس مسئلہ میں رہنمائی کر رہا ہے۔ حضرت طالوت کا واقعہ بیان فرماتے ہوئے حق تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

وقال لهم نبيهم ان اٰية ملكه ان يأتيكم التابوت فيه سكينة من ربكم وبقية مما ترك اٰل موسىٰ واٰل هارون تحمله الملٰئكة ان فى ذٰلك لاٰية لكم ان كنتم مؤمنين۔	"اور ان کے نبی (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ طالوت کے (نامزد شدہ) بادشاہ ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ اس تابوت کو لے آئیں گے جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسکین کا سامان اور آل موسیٰ وآل ہارون کے متروکہ (تبرکات) ہیں۔ بیشک یہ (اچھی خاصی) نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو"

آخری آیت اس وقت سب سے زیادہ قابل توجہ ہے۔ اُس زمانے کے نبی علیہ السلام اس علامت پر یقین کر کے طالوت کو "ملک" تسلیم کرنے کا حکم دیکر اقامت حکومت کو ایمان کا تقاضہ قرار دے رہے ہیں، ظاہر ہے کہ علامت کو صحیح سمجھ لینا مطلوب نہیں تھا۔ بلکہ اصل مطلب اقامتِ حکومت تھا۔ اِس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ علامت دیکھ کر حکومت قایم کرلو یہ ایمان کا تقاضہ ہے۔ لیکن اگر اسے نہ بھی تسلیم کیا جائے تو بھی استدلال میں کوئی کمزوری نہیں پیدا ہوتی۔ اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ قرآن حکیم اقامتِ حکومت کو ایمان کا اقتضاء قرار دے رہا ہے خواہ یہ بالواسطہ ہی ہو۔ اس کے بعد مسئلہ میں کسی دوسری رائے کی کیا گنجائش باقی رہجاتی ہے؟ جو چیز ایمان کا تقاضہ ہو اس پر قربِ حق موقوف نہو، اور اس سے پہلوتہی کرنے میں حق تعالےٰ کی ناراضی کا خطرہ نہو اس کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔

یہ مسئلہ کا ایک پہلو تھا، اس کا دوسرا پہلو بہت اہم ہے۔ غیر اسلامی اقتدار کی ماتحتی جو محکومانہ ذہنیت اور جذبہ وقابلیت پیدا کرتی ہے اس کے مُضر اثرات اکثر وعموماً اعمال تو اعمال عقائد و ایمان تک پہنچتے ہیں۔ اور بہت کم ایسے صاحبِ عزم اشخاص نکلتے ہیں جو اُن اثرات سے محفوظ رہیں۔ بحیثیت مجموعی قوم اس سے کسی حالت میں نہیں بچ سکتی۔ تاریخ وتجربہ دونوں کو اس رائے کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مبین نے بنو اسرائیل کے جو حالات ذکر کئے ہیں اُن پر ایک نظر ڈال جائیے تو آپ کو معلوم ہوجائیگا کہ غیروں کی غُلامی ومحکومی نماز، روزہ، ذکر وفکر وغیرہ عبادات ہی پر نہیں بلکہ عقائد وایمان پر کیا اثرات ڈالتی ہے۔

اِس چیز سے کسے اختلاف ہوسکتا ہے کہ انسان اگر ارادہ کرے تو ہر گُناہ سے بچ سکتا ہے اور ہر حالت میں بچ سکتا ہے لیکن شریعت اسلامیہ نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا ہے کہ گناہوں سے بچنے اور اللہ تعالےٰ کا راستہ اختیار کرنے کا سارا بار انسان کی انفرادی قوتِ ارادی پر ڈال دیا ہو۔ بلکہ اس نے نہایت حکیمانہ طرز پر ان اسباب کو دُور کرنے کا بھی حکم دیا ہے جو قوتِ ارادی کو کمزور کر دیتے ہیں اور ضعیف الارادہ اشخاص ان کی مقاومت سے

عاجز ہوکر گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً شریعت بدکاری سے بچانا چاہتی ہے لیکن صرف اِسی حکم پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ غیر محرم مرد و عورت کو ایک ساتھ سفر کرنے سے بھی منع کرتی ہے۔ اِسی طرح تخلیہ میں بھی اُن دونوں کو اکٹھا ہونے سے روکتی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں فی نفسہ ممنوع اور قبیح نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ یہ اس فعل قبیح کے ایسے شدید محرکات ہیں جن کی مقاومت ضعیف الارادہ اشخاص کے لئے بہت مشکل ہے، اور دُنیا میں زیادہ تر اشخاص ایسے ہی ہوتے ہیں، اِس لئے اُن کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔

حکومت کے مسئلہ کو بھی اسی روشنی میں غور کر لیجیے۔ ایک غیر اسلامی فاسق حکومت میں رہکر عام مسلمانوں کا دین کے صحیح حدود پر قائم رہنا اگرچہ عقلاً ممکن ہے لیکن عادتاً بالکل ناممکن ہے۔ تجربات و تاریخ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ "الناس علےٰ دین ملوکھم" کا حکیمانہ و نفسیاتی قانون اٹل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے بھی بعض ایسے واقعات بیان فرمائے ہیں جن سے اِس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے زمانے میں بنو اسرائیل کی جو کیفیت ہوئی اُس کو سامنے رکھئے تو غیروں کی محکومی اور فقدانِ اقتدار کے ہلاکت آفرین اثرات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

فراعنہ اور قبطیوں کی محکومی اور برسہا برس کی غلامی نے اُن میں سے خود اعتمادی، خود داری اور غیرت دینی و قومی کے عناصر بالکل سلب کر لئے تھے۔ بشدہ شدہ اس غلامی کا حملہ ایمان پر بھی ہوا اور اُسے وہ مُردہ نہ کر سکی تو کم از کم اُسے اِس قدر مجروح و نحیف کر دیا کہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السّلام کی عیسیٰ نفسی بھی اُسے اُس وقت تک صحت نہیں عطا کر سکی جب تک اس محکومی سے اُنھیں نجات نہیں ملی اور اس نجات پر ایک عرصہ نہیں گذر گیا۔ پہلے ہی امتحان میں اُن کی ناکامی قرآن مجید میں صاف طریقہ سے مذکور ہے۔ ساحلِ بحر پر پہونچکر اور فرعونیوں کو دیکھکر دو جلیل القدر نبیوں کی موجودگی اور اُن کے وعدوں کے باوجود "انا لمدرکون" کی صدائے بے ہنگام کیا ضعفِ ایمانی کا ثبوت نہیں ہے؟ ایمان کا یہ زخم اسی فقدان خود اعتمادی اور جذبۂ خود حقارتی کا لگایا ہوا تھا۔ جسکی پرورش سالہا سال کی محکومی و غلامی نے کی تھی۔

غلامی کے یہ مہلک اثرات اس پہلی ناکامی اور اس پر تنبیہ سے بھی دُور نہیں ہوئے بلکہ توحید کی وصیت کرنے والے اللہ کے نبی یعقوب (علیہ السلام) کی یہ اولاد کُھلم کُھلا شرک و بُت پرستی کی خواہشوں کا اظہار کرنے لگی اور اپنے دور کے موحد اعظم حضرت موسیٰؑ ہی سے یہ فرمائش کی کہ "اجعل لنا الٰھاً کما لھم اٰلھۃ"۔ اِسی محکومانہ ذہنیت اور اُس سے پیدا ہونے والے ضعفِ ایمان کا اثر تھا کہ "ارضِ مقدسہ" کے حاصل کرنے کے لئے جب حُکم دیا گیا، تو اللہ اور اُس کے رسول کے وعدوں کے باوجود اس قوم نے جی چھوڑ دیا اور جب تک وہ محکوم نسل ختم نہ ہو گئی اُس وقت تک یہ قوم اس قابل نہو سکی کہ دُشمنانِ دین سے مقابلہ کر کے "ارضِ مقدسہ" کو حاصل کر سکتی۔

دُور کو چھوڑ کر اب قریب کی طرف آئیے۔ خود ہمارے اوپر کیا گذری اور گُذر رہی ہے۔ انگریزی دور سے پہلے مُسلمانوں کی دینی حالت جو کچھ بھی اور انگریزوں کی محکومی کے بعد اس میں جس تیزی اور سُرعت کے ساتھ انحطاط ہوا ہے اور ہماری تہذیب معاشرت، معاش یہانتک کہ ایمان میں جس قدر شدید تغیر ہُوا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ آج کے مسلمان کا ایک صدی پہلے کے مسلمان سے مقابلہ کیجیے تو زمین و آسمان کا فرق محسوس ہوگا۔ اس تغیر و انحطاط کی نفسیاتی توجیہ بجز محکومی کے اور کسی چیز سے بھی کیجا سکتی ہے؟

محکومی کے یہ بدیہی اثرات پیش نظر رکھنے کے بعد یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اقامت حکومت کو قرب الٰہی میں کوئی دخل نہیں ہے اور بغیر اس کے رضائے حق کے راستہ میں کوئی رُکاوٹ نہیں پیش آتی؟

فرد پر اجتماع کو قیاس کرنا ایک بُنیادی غلطی ہے۔ غیروں کی محکومی کے ساتھ چند صاحب ہمّت و عزیمت اشخاص کا دینی ترقی کر لینا ممکن ہے لیکن کسی قوم کا صراطِ مستقیم پر گامزن رہنا اگر محال عقلی نہیں تو محال عادی ضرور ہے۔

پانچویں دلیل

کسی شے کو جزو دین یا خارج از دین کہنے کا یہ معیار ہی سرے سے غلط ہے۔ اگر کوئی حکم شرعی کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دین سے خارج ہو گیا۔ اگر یہ معیار صحیح مان لیا جائے تو بہت سے مسلمہ احکام و اجزاء دین کو اس سے خارج کر دینا پڑے گا۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ ایمان کا زبان سے اقرار و اظہار بلا اختلاف دین ہے۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہے:۔

الایمان بضع وسبعون شعبة افضلها قول لا اله الا الله وادناها اماطة الاذی عن الطریق والحیاء شعبة من الایمان۔ (مشکوٰۃ)	"ایمان کے کچھ اوپر ستر شعبے ہیں۔ اُن میں سے افضل ترین شعبہ زبان سے لا اله الا الله کہنا ہے اور ادنیٰ ترین شعبہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا ہے، اور حیا بھی دین کا ایک شعبہ ہے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس اقرار باللسان کو دین کا برترین شعبہ فرماتے ہیں۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دین نہیں ہے۔

لیکن خود قرآن مجید سے ثابت ہے کہ جب جان کا شدید خطرہ ہو تو اقرار باللسان کا یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض صورتوں میں اظہار کفر اور استبطان ایمان بھی جائز رکھا گیا ہے کیا مندرجہ بالا معیار کے بموجب کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ دین میں شامل نہیں ہے؟ کیا مسلمہ طور پر اقرار باللسان نماز، روزہ وغیرہ دیگر عبادات سے افضل و اہم نہیں ہے؟ پھر اگر بالفرض یہ بھی دین سے خارج ہے تو ان اعمال کو دین میں کس طرح داخل سمجھا جا سکتا ہے؟

یہی معاملہ "اماطة الاذی عن الطریق" اور "حیاء" کا ہے بعض صورتوں میں یہ دونوں چیزیں واجب کیا جائز بھی نہیں رہتیں بلکہ اُن کی نقیض واجب ہو جاتی ہے مثلاً جہاد میں کفار کے راستے میں رکاوٹ ڈالنا واجب ہے اسی طرح ضروری احکام دینیہ معلوم کرنے میں حیا کرنا مذموم ہے۔

زکوٰۃ، حج، قربانی، صوم، نماز جمعہ، یہ سب احکام ایسے ہیں جو بعض شرائط کے ساتھ مشروط ہیں اور ہر حالت میں ضروری نہیں ہوتے، ان سب کو دین سے خارج کرنے کی جرأت کس طرح کی جا سکتی ہے؟

اگر مندرجہ بالا کل احکام چند شرائط کی پابندی کی وجہ سے دین سے خارج نہیں ہو سکتے تو اقامت حکومت ہی کا فریضہ محض مشروط ہونے کی بناء پر دین سے باہر کیوں قرار دیا جائے؟ اور اسے دین کا ایک شعبہ کہنے میں کیا رکاوٹ ہے؟

صحیح مسلک

اقامت حکومت اسلامیہ کے سلسلہ پر ہم اپنا مسلک یاددہانی کے لئے دوبارہ ذکر کرتے ہیں۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ اقامت حکومت اسلامیہ کا حکم بھی صوم وصلوٰۃ کے حکم کی طرح ایک دینی حکم ہے اور سیاسیات بھی دوسرے معاملات کی طرح دین کا ایک بہت بڑا شعبہ ہے۔ ہمارے نزدیک اس بحث میں پہلی تنقیح کا صحیح جواب یہی ہے اور یہی جمہور اہلسنت والجماعت کا مسلک ہے دلائل درج ذیل ہیں:۔

قرآن مجید

سب سے پہلے ہم کتاب حکیم کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں اسکی کیا ہدایت ہے۔ آیت ذیل پر نظر کیجئے:۔

اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔	"اللہ تعالیٰ اس کے رسول اور امیر کی اطاعت کرو جو تم ہی میں سے ہو"

اِس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر حکومت اسلامیہ قائم کرنا فرض ہے۔ اس مدعا پر استدلال دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

(الف) آیت میں اطاعت اولی الامر کا حکم دیا گیا ہے جس کے لئے کسی امیر کا وجود لازم ہے اس لئے اقتضاء النص سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی امیر کا مقرر کرنا بھی مسلمانوں کے ذمہ واجب ہے، عرض کیا جا چکا ہے کہ اقتضاء النص بھی عبارۃ النص کی طرح قطعی دلیل ہے، اِس لئے عبارۃ النص کا مطالبہ صحیح نہیں ہے اِس استدلال پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ اطاعت امیر کے حکم کے لئے مقرر امیر کا حکم لازم نہیں ہے۔ آیت کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے

کہ اگر امیر موجود ہو تو اُس کی اطاعت کرو لیکن یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ امیر کو وجود میں بھی لاؤ۔ قرآن مجید میں اس کے نظائر موجود ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ کا حکم موجود ہے لیکن ادائے زکوٰۃ کے حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان مال نصاب جمع کرنے کا بھی مکلف ہو۔

اس تنقید کی غلطی سطور ذیل سے واضح ہو جاتی ہے:۔
جن احکام کو تنقید میں بطور نظیر پیش کیا گیا ہے اُن میں بھی اگر خود کتاب و سنت نے شرائط نہ لگائے ہوتے تو وہ بھی علی الاطلاق ہی ثابت ہوتے۔ اور جن اُمور پر اُن کی بجا آوری موقوف ہے اُن کا وجوب بھی قطعی طور پر ثابت ہو جاتا۔ مثلاً اگر سنت نبویہؐ نے وجوب زکوٰۃ کے لئے نصاب کی قید نہ لگائی ہوتی تو صرف "وآتوا الزکوٰۃ" سے مطلق انفاق فی سبیل اللہ ثابت ہوتا۔ اور اس مقصد کے لئے روپیہ اکٹھا کرنا بھی واجب ہوتا۔ اگر حج کے حکم میں "من استطاع الیہ سبیلا" کی قید نہ لگی ہوتی تو ہر شخص پر حج کرنا اور اس کے لئے استطاعت حاصل کرنا واجب ہوتا۔ بنا بریں ان احکام پر زیر بحث حکم کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہاں اطاعت امیر کا حکم مقید و مشروط نہیں ہے۔

(ب) آیت ایک دوسرے طریقے سے بھی اس حکم کو واضح کر رہی ہے۔ تمہیدی طور پر اس حقیقت کو پیش نظر رکھیئے کہ اجتماع کے لئے کسی نظام حکومت کا قیام فطرت انسانی کا تقاضہ ہے۔ یہ چیز عادتاً بالکل غیر ممکن ہے کہ کوئی اجتماع بغیر کسی نظام حکومت کے پایا جائے اور اس سے کلیۃً خالی ہو۔ مسلمانوں کا کوئی اجتماع اس کلیہ سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ اسلام نے نظم و اجتماعیت پر جس قدر زور دیا ہے اُسے سامنے رکھیئے تو اس استثناء کا تصور بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس نظام کی دو ہی شکلیں عقلاً ممکن ہیں یعنی اسلامی یا غیر اسلامی۔ آیت میں اطاعتِ امیر کے حکم کے ساتھ "منکم" کا لفظ صاف طریقے سے بتا رہا ہے کہ اس نظام کو اسلامی ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد دو ہی راستے باقی رہتے ہیں یعنی اگر کوئی اسلامی نظام قائم ہے تو اُس کی بقاء کی کوشش کی جائے۔ اور اگر نہیں قائم ہے تو بشرط استطاعت اُسے قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر مؤخر الذکر صورت میں "اقامتِ حکومت اسلامیہ" کی کوشش نہ کی جائے گی تو اصول مذکورۂ تمہید کے بموجب کوئی نہ کوئی نظام ضرور قائم ہوگا اور یقیناً ایسی صورت میں وہ غیر اسلامی ہوگا۔ یا کم از کم اس کے غیر اسلامی ہونے کا خطرہ تو ضرور ہوگا۔ غالباً یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ شریعت اسلامیہ ایسے پُر ضرر خطرے کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ان سب باتوں کو سامنے رکھیئے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ لفظ "منکم" فریضۂ اقامت امیر کے لئے ایک واضح نشان ہے اور آیت بہت صاف طریقے سے مسلمانوں پر یہ فرض عائد کر رہی ہے۔

دوسری آیت

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم۔

"ان (کفار) کے مقابلے کے لئے اپنی حسب استطاعۃ قوۃ اور گھوڑے تیار رکھو جن سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کر سکو"

آیت صاف طریقے سے بتا رہی ہے کہ مسلمانوں پر بشرط استطاعت حکومتِ اسلامیہ کا قائم کرنا اور اگر قائم ہو تو اُسے باقی رکھنا فرض ہے، اس لئے کہ نظام حکومت خود "قوۃ" ہے۔ اس لئے مامور بہی کا ایک فرد بلکہ سب سے زیادہ عظیم الشان اور اہم ترین فرد ہے جس کے بغیر کوئی قوتِ مقابلہ عادتاً کارآمد اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ دوسری قوتیں فراہم کی جا سکتی ہیں۔ گویا یہ خود قوت بھی ہے اور دوسری قوتوں کا سرچشمہ اور انھیں کارآمد و مفید بنانے کے لئے شرط بھی۔ "اعدوا" سے اور کسی قوت کو فراہم کرنے کا وجوب ثابت ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو لیکن اس کا وجوب تو یقیناً ثابت ہوتا ہے۔

آیت کا دوسرا حصہ جو "ترھیب" کی ترغیب دے رہا ہے وہ بھی اس منزل کے لئے نشانِ راہ ہے۔ عادتاً یہ ناممکن ہے کہ ایک مستحکم حکومت متفرق افراد سے مرعوب ہو جائے۔ کسی جماعت کی ہیبت اُسی وقت دوسروں کے دلوں پر بیٹھتی ہے جب اُس کا کوئی نظام حکومت قائم ہو۔ اگر "ترھیب" مقصود ہے تو یقیناً نظام حکومت کا قائم کرنا بھی مقصود ہے۔ اس کے واجب ہونے میں کسے کلام

ہو سکتا ہے اور اس کے بعد اقامتِ حکومت کو واجب سمجھنا کس طرح ممکن ہے؟۔

تیسری آیت وقاتلوا الذین لا یؤمنون بالله ولا باليوم الآخر ولا يحرمون ما حرم الله ورسوله ولا يدينون دين الحق من الذين اوتوا الكتاب حتى يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون۔

"اہل کتاب میں سے اُن لوگوں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں قرار دیتے اور دین حق نہیں اختیار کرتے، اُس وقت تک قتال کرو کہ وہ پست ہو کر اپنے ہاتھ سے تمھیں جزیہ دیں۔"

(سورہ انفال پ۱۰)

زیر بحث مسئلہ اس آیت سے کئی طریقوں سے ثابت ہے۔ لیکن ہم قریب ترین راستے سے منزلِ مقصود تک پہونچنا چاہتے ہیں۔ آیۃ کریمہ اہلِ اسلام کو قتال کا حکم دیتی ہے اور اس کی انتہاء دو چیزوں پر کرتی ہے۔ 'اعطاءِ جزیہ' اور 'صغارِ کفار'۔ سوال یہ ہے کہ حکومت و سلطنت نام کس چیز کا ہے؟ کیا اقتدار و غلبہ حکومت کی حقیقت کا جزو نہیں ہے؟ اور کیا اہلِ باطل کو صاغر بنا کر ان سے ٹیکس وصول کرنا اقتدار کا ایک فرد نہیں ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ جب کفار کو محکوم و صاغر بنا کر ان سے ٹیکس وصول کرنا اور اس مقصد کیلئے سر دھڑ کی بازی لگانا مامور بہ اور فرض ہے۔ تو اقتدار و حکومت کا حاصل کرنا اور اس کا قائم کرنا بھی فرض ہوگا اس لئے کہ وہ کونسی محکومیت ہے جس کا تصور بغیر تصورِ حاکمیت ہو سکتا ہے، اور وہ کونسا محصول ہے جو بغیر حکومت کے پایا جا سکتا ہے؟ دو جملے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ فلاں قوم کو محکوم بنالو، دوسرا یہ ہے کہ فلاں قوم کے حاکم بنجاؤ۔ کوئی مجھے بتائے کہ ان دونوں کے مفہوم میں کیا فرق ہے؟ اگر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو اس آیۃ سے حکومت قائم کرنے کی فرضیت یقیناً ثابت ہوتی ہے۔

چوتھی آیت وعد الله الذين امنوا وعملوا الصلحت ليستخلفنهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذي ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنا۔ يعبدونني لا يشركون بي شيئا۔

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے اعمال صالحہ کئے اللہ تعالیٰ نے اُن سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں اپنا خلیفہ بنائیں گے جیسے کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنا چکے ہیں اور ان کے اس دین کو تمکین عطا فرمائیں گے جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کیلئے پسند کر لیا ہے اور اُن کے خوف کو امن سے بدل دینگے (بشرطیکہ) کہ وہ میری ہی عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔"

آیۃ مبارکہ آیۃ استخلاف کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں استخلاف فی الارض۔ تمکین دین اور امن و امان۔ یہ وعدہ اُن لوگوں سے فرمایا گیا ہے جو مومن ہونے کے ساتھ اعمال صالحہ کی نعمت سے بھی بہرہ یاب ہوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان انعامات کو حاصل کرنے کے لئے کوئی کوشش کرنی چاہئے یا نہیں؟ اور اگر کی جا سکتی ہے تو وہ کیا ہو سکتی ہے؟۔

جو حضرات کہ اقامتِ حکومت کے معاملے کو دین کی فہرست سے خارج کر دیتے ہیں۔ اُن کا فیصلہ تو ظاہر ہے یعنی خلافت و حکومت کو طلب کرنا اور اس کے لئے کوشش کرنا کوئی دینی متقیانہ اور مناسب طرزِ عمل ہی نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ضروری ہو۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے اور آیت اس نعمتِ عظیمہ کو حاصل کرنے کی ترغیب دے رہی ہے۔

ہماری یہ رائے ایک عام کلیہ پر مبنی ہے جس کی تصدیق خود فطرتِ انسانی کرتی ہے۔ کسی باعظمت ہستی کے انعام کو ناقابلِ التفات سمجھنا نعمت کی ناقدری، منعم کی ناشکری اور اس کی شخصیت کے ساتھ ایک نوع کی سوءِ ادبی ہے۔ حق تعالیٰ جل شانہ کے انعامات کے متعلق جو معاملہ ہونا چاہئے اُسے اسی کلیہ کی روشنی میں دیکھ لیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے جن نعمتوں کا وعدہ فرمایا ہے اگر اُن کا حاصل کرنا اختیار میں ہو اور اُن کی طلب و تحصیل سے کوئی دوسرا مانع شرعی موجود نہ ہو تو یقیناً اُن میں حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا ضروری ہے بغیر کسی عذرِ شرعی کے اس سے پہلو تہی کرنا ناقدری

ناشکری، اور حق تعالیٰ کے ساتھ ایک نوع کی سوءِ ادبی ہے۔ اگر حق تعالیٰ ایک پرکاہ کا بھی وعدہ فرمائیں تو اُسکی طلب کرنا عین عبدیت ہے اور اُس سے استغنار کا اظہار آئینِ بندگی کے خلاف ہے چہ جائیکہ سلطنت و حکومت جو دینی دنیاوی اعتبار سے حق تعالیٰ کی ایک عظیم الشان نعمت بلکہ بہت سی دوسری نعمتوں کے اعتبار سے ام النعم ہے۔

سیاق آیت پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے تو مسئلہ اور بھی صاف ہو جائے گا۔

آیت میں دو نعمتوں کے وعدے اور بھی ہیں یعنی تمکین دین اور امن و امان۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دین کے استحکام کے لئے کوشش کرنا شرعاً مطلوب نہیں ہے؟ اور استطاعت رکھتے ہوئے اِس سے پہلوتہی کرنا معصیت نہیں ہے؟ اِسی طرح ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرنا جن میں مسلمان بے خوفی اور آزادی کے ساتھ دین پر عمل کر سکیں یقیناً حسبِ استطاعت واجب ہے اور ان واقعات کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ کہنا کہ تاجِ خلافت سے سرفرازی کے لئے جدّ و جہد کرنا غیر ضروری ہے ایک عجیب بات ہوگی۔ تین نعمتوں کا وعدہ ہے اُن میں سے دو تو مطلوب ہوں اور ایک قطعاً غیر مطلوب۔ اِس ترجیح بلا مرجح کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے؟ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم اس واقعہ کو پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ مؤخر الذکر دونوں نعمتیں درحقیقت نعمت خلافت کے اثرات اور اس کے اُوپر موقوف ہیں۔ بغیر حکومت و اقتدار کے اسلام کی آزادی و استحکام کا تصور بھی محال ہے۔

مخالف حضرات اس دلیل کا جواب ایک دوسرے طریقے سے دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ جلّ شانہٗ نے حکومت و خلافت کا وعدہ فرمایا ہے اور اُسے ایمان و عمل صالح پر معلق فرمایا ہے۔ آیت ہمیں ہدایت کرتی ہے کہ ہم اصلاحِ نفس اور اطاعت الٰہی میں لگ جائیں اس کے بعد خلافت و حکومت کا موعودہ انعام خود حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوگا۔ ع

"کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند"

اقامتِ حکومت کے لئے لڑنا جھگڑنا، انتخابات میں حصّہ لینا، یا پارٹیاں بنانا خواہ کتنی ہی سچائی، دیانتداری اور آخرت کے متعلق احساس ذمہ داری کے ساتھ کیوں نہو، بہر کیف آیت کے بتائے ہوئے طریق کار سے تجاوز ہے۔ یہ حضرات اس موقع پر جب عمل صالح کا تذکرہ فرماتے ہیں تو ان کے ذہن میں صرف انفرادی اعمال کا تصوّر ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کثرت صلوٰۃ و صوم اختیارِ خلوت، تسبیح و تہلیل، انفرادی معاملات کی صفائی، اخلاقِ صالحہ کا اکتساب اور اسی طرح کے دوسرے اعمال صالحہ جو انسان کی انفرادی اور شخصی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں مومن کے سر پر بالآخر تاجِ خلافت رکھ دینگے اور غیب کے وہ اسباب پیدا ہو جائیں گے جو ایک گدائے خاک نشیں کو بغیر کسی کوشش و محنت کے فرشِ خاک سے اُٹھا کر عرشِ حکومت پر بٹھا دیں گے۔

مضمون کے ابتدائی حصے کی طرف پھر توجہ فرمائیے تو اس خیال کی غلطی بالکل واضح ہو جائے گی۔ اسلام اور اعمال صالحہ کو انسان کی انفرادی زندگی تک محدود کر دینا کھلی ہوئی غلطی ہے۔

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جس طرح اعمال صالحہ ہیں اسی طرح اقامتِ خلافت و حکومت کے لئے کوشش کرنا بھی عمل صالح ہے۔ اور بہت ہی اہم عمل صالح ہے اس لئے آیت کا یہ مفہوم سمجھنا کہ محض انفرادی زندگی کی اصلاح سے خلافت کی نعمت خود بخود بغیر کسی کوشش کے مل جائے گی سخت غلطی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو جہاد و قتال کی تکلیفیں کیوں گوارا کرنی پڑتیں؟ اور قرآن مجید میں اس قدر کثرت و تکرار کے ساتھ جہاد کا حکم کیوں نازل ہوتا؟ نہ کوئی معرکہ بدر ہوتا نہ احد کا نہ غزوۂ طائف، نہ قتال خیبر نہ جہاد حنین۔ سنۃ اللہ بھی کتاب اللہ کی مفسّر ہوتی ہے۔ کسی آیت کی کوئی ایسی تفسیر جو سنۃ اللہ کے خلاف ہو اُس وقت تک ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جب تک کسی بہت قوی دلیل سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ اس کا اشارہ کسی خارق عادت شئے کی طرف ہے۔

سنۃ اللہ یہ ہے کہ دُنیا کے اس میخانے میں جامِ حکومت اُسی کا ہوتا ہے جو اُسے بڑھ کر اُٹھا لے، اِس لئے "عملوا الصلحٰت" کی تفسیر میں اقامتِ خلافت کی جدّ و جہد کو بھی داخل کرنا پڑے گا جس کی طرف

علاوہ مشاہدہ سنۃ اللہ کے خود قرآن مجید بھی صاف اشارہ کر رہا ہے۔ میرا اشارہ "ارضِ مقدسہ" کے اُس مشہور واقعہ کی طرف ہے جس میں بنواسرائیل نے قتال سے انکار کر دیا تھا۔ غور فرمائیے کہ کیا بنواسرائیل اُس وقت فرائضِ دینی کے پابند نہ تھے؟ کیا حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کے ایسے جلیل القدر انبیاء کی موجودگی میں اِس قسم کی بدگمانی کی جاسکتی ہے مگر حکومت و سلطنت کے لئے جس عمل صالح کی ضرورت تھی، اس کے فقدان نے نہ صرف یہ کہ انھیں اس نعمت سے محروم رکھا بلکہ اللہ تعالےٰ کے غضب میں بھی مبتلا کیا اور فاسق کا لقب دلوایا۔

مضمون کے تنقیدی حصے میں میں نے قرآن مجید کے دو مقامات سے کچھ آیتیں نقل کی ہیں۔ پہلی اسی واقعہ کے متعلق ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بنواسرائیل کو ارضِ مقدسہ میں داخل ہو کر سلطنت و حکومت قائم کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ اور دوسری طالوت و جالوت کے متعلق ہے جس میں بنواسرائیل اپنے نبی سے سلطنت قائم کرنے اور امیر مقرر کرنے کی استدعا کرتے ہیں۔ گویا اقامتِ حکومت کی وہ کوشش کرتے ہیں جو اُس وقت کے لحاظ سے مناسب تھی۔

قرآن حکیم کے ان دونوں بیانات پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے۔ ان سے بھی آپ یہی سمجھیں گے کہ اقامتِ حکومت اسلامیہ مامور بہ ہے۔ یہ اصول ذہن میں رکھئے کہ اُمم سابقہ کے متعلق جو احکام قرآن مجید میں مذکور ہیں اُس وقت تک ہمارے لئے بھی واجب العمل سمجھے جائیں گے جب تک کسی دلیل سے ان امتوں کے ساتھ ان کی خصوصیت نہ ثابت ہو جائے۔ دونوں قرآنی بیانات کی اس موقع سے مناسبت مزید واضح کئے دیتا ہوں۔ پہلے مقام پر حضرت موسیٰ کی قیادت میں بنواسرائیل منظم ہوتے ہیں لیکن قومی وطن اور مملوکہ سرزمین کے فقدان کی وجہ سے یہ منظم سلطنت نہیں کہی جاسکتی۔ اِس تنظیم کو درجہ حکومت و سلطنت پر پہونچانے کے لئے حضرت موسیٰ بامرِ الٰہی، اس مقدس سرزمین پر جبراً قبضہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ کیا یہ اقامتِ حکومت کی کوشش نہیں کہی جائے گی؟

دوسرے بیان کی مناسبت اس سے زیادہ واضح ہے۔ اسرائیلیوں نے تقرر امیر کی درخواست کر کے اقامتِ حکومت کی طرف پہلا قدم اُٹھایا اور بعد تقرر اس کی اطاعت کے اقرار کر کے دوسرا

یہ چند آیات تو اس قسم کی ہیں جن سے ذہن براہِ راست اِس حقیقت تک پہونچ جاتا ہے کہ اقامتِ حکومت اسلامیہ بھی فرائضِ دینی میں سے ایک فریضہ ہے، اور دین کا ایک اہم حصّہ ہے لیکن اگر ہم ایک درمیانی زینے کی وساطت سے بامِ مدعا پر پہونچنا چاہتے ہیں تو قرآن مجید کا ایک اچھا خاصا حصّہ ہماری رہنمائی کرتا ہوا ملے گا۔

کتابِ عظیم نے جہاد کا فریضہ بھی مسلمانوں پر عائد کیا ہے۔ حدود و قصاص کو جاری کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ اور سب سے بڑی چیز یہ ہے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کو فرض قرار دیا ہے۔ تو کیا جہاد بغیر حکومت کے ممکن ہے؟ کیا حدود کا اجراء اس کے بغیر ہو سکتا ہے؟ اور کیا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ کامل طریقے سے بغیر قوت و حکومت کے ادا کیا جاسکتا ہے؟ اِن سب کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا فرائض تو استطاعت کے ساتھ مشروط ہیں، اور استطاعت حاصل کرنے کی فرضیت کسی آیت سے ثابت نہیں ہے۔ یہ اعتراض اور اس کا مفصّل و شافی جواب میں "اطاعت اولی الامر" کے بیان میں ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن یہاں اِس مسئلہ کے متعلق کچھ مزید باتیں عرض کرنی چاہتا ہوں۔

مندرجہ بالا، اور ان کے مماثل کل احکام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذیل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس امر و نہی کے فرض و مامور بہ ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ شریعت نے اِس لئے تین درجات مقرر فرمائے ہیں۔ اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ منکر کو قوت و طاقت سے مٹا دیا جائے اور معروف کو اسی طرح رائج کیا جائے۔ محض زبان سے نکیر یا صرف قلب سے بُرا سمجھنا نیچے کے درجات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب دین میں ترقی کی کوشش کا حکم دیا گیا ہے تو اس اعلیٰ درجہ کا حاصل کرنا اور اس کی استطاعت حاصل کرنے کی امکانی کوشش کرنا کیوں مامور بہ اور مطلوب نہ ہوگا؟ فرض کیجئے ایک زہریلا سانپ ایک مسلمان کو ڈسنا چاہتا ہے، ہمارے ہاتھ میں کوئی ڈنڈا نہیں ہے مگر ڈنڈا کچھ فاصلہ پر رکھا ہوا ہے۔ موجودہ حالت میں ہم میں سانپ کو مارنے کی استطاعت

نہیں ہے لیکن کیا استطاعت حاصل کرنے کی کوشش بھی ہم پر واجب نہیں ہے؟ اگر اس موقع پر ہم یہ کہہ کر خاموش ہو جائیں کہ شریعت نے ایسے موقع پر مومن کی نصرت تو واجب کی ہے مگر اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس کی استطاعت حاصل کرنا بھی واجب ہے، اُسے سانپ ڈستا ہے تو ڈس لے ہمارے اُوپر ڈنڈا مہیا کرنا واجب نہیں ہے تو کیا یہ طرزِ عمل شرعاً، اخلاقاً یا عقلاً کسی طرح صحیح ہوگا؟ اِس مثال کی روشنی میں زیرِ بحث مسئلہ پر غور فرمائیے۔ دُنیا میں شرک پھیلے، بدکاریاں علی الاعلان ہوں، قمار بازی اور شراب خواری عام ہو جائے احکام الٰہی کی کھلم کھلا مخالفت کی جائے۔ شعائر اسلامی پامال ہوں دین کا مذاق اُڑایا جائے، باطل سربلند اور حق سرنگوں ہو، ہماری آنکھیں یہ سب دیکھتی رہیں اور ہمارے کان سب کچھ سنتے رہیں۔ مگر ہم یہ کہہ کر اطمینان سے بیٹھ رہیں کہ ان سب منکرات کو قوت وطاقت سے روکنے کی ہم میں استطاعت نہیں ہے اور استطاعت کا حاصل کرنا فرض نہیں ہے اس لئے ان سب کو بدستور رہنے دو اور شیطان کو اپنی سلطنت وسیع کرنے کا پُورا پُورا موقع دے دو۔ یہ طرزِ عمل کہاں تک صحیح اور اسلامی اُصول کے مطابق ہے؟ اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

دو لفظ اور سُن لیجئے۔ جہاد کی فرضیت قرآن مجید و حدیث نبوی سے ثابت ہے۔ اور اس کا مقصد اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا ہے۔ دونوں باتوں میں کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن کلمۃ اللہ کے بلند ہونے کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ کیا اس کا مطلب اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کے احکام کا اجراء اور ان کا نفاذ ہو؟ اس کی بجز قیامِ حکومت کے اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی یہ قاعدہ بھی پیشِ نظر رکھیے کہ جب کسی حکم شرعی کی صرف ایک ہی عملی شکل عقلاً و عادتاً ممکن ہو تو شرعاً وہی متعین اور مطلوب ہو جاتی ہے شریعت اُسی کو وجود میں لانے کا مطالبہ کرتی اور اُس حکم شرعی کا مفہوم یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسی شکل کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اس قاعدے کو سامنے رکھیئے تو وہ سب آیات جو جہاد کو فرض قرار دیتی ہیں، اقامتِ حکومت کی فرضیت بھی ثابت کریں گی +

(باقی آئندہ)

قسط دوسری:-

عہدِ نبوی میں قرآنِ مجید کی تدوین و ترتیب

(مولٰنا محمد بدرالدین صاحب علوی - مسلم یونیورسٹی - (علیگڑھ)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ:-

(الف) کیا فنِ تحریر اُس وقت میں ایسا عام ہو چکا تھا کہ قرآن مجید کے مکتوبہ نسخوں کا بکثرت پایا جانا فرض کیا جا سکتا ہے؟

(ب) اور اس مقصد کے لئے کاغذ دست یاب ہوتا تھا، خود قرآن مجید ہی سے اس کا جواب مِل جاتا ہے۔

(الف) ایک مقام پر حکمِ خداوندی ہے:-

یاأیها الذین امنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمّی فاکتبوہ۔

"یعنی اے ایمان والو جب تم کوئی قرض کا معاملہ کرو جو مدّت معیّنہ کے لئے ہو تو لکھ لیا کرو۔"

اِس عام حکم سے بہت وضاحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ فنِ تحریر اتنا عام تھا کہ ہر شخص ہر وقت اِس کا انتظام کر سکتا تھا۔

اِس فن کے مروّج ہونے کا ثبوت مزید حسب ذیل اُمور سے بھی ملتا ہے:-

(۱) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے ممالک کے بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط بھیجے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے:-

لما اراد رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم ان یکتب الی الروم قالوا انّهم لا یقرءون کتابًا الّا مختومًا قال فاتخذ رسول اللہ خاتمًا من فضّة۔

(صحیح مسلم ج ۲ صـ۱۵۸)

"یعنی جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ لوگ خط کو اُس وقت تک نہیں پڑھتے جبتک اُس پر مُہر نہ لگی ہو چنانچہ اس مقصد کیلئے حضورؐ نے ایک چاندی کی انگوٹھی تیار کرائی۔"

(۲) حدیبیہ کے صلحنامہ کی کتابت اِتنی ثابت شدہ ہے کہ اس کیلئے کسی حوالہ کی ضرورت نہیں۔

(۳) صحیح مسلم میں ہے:-

لا تکتبوا عنی غیر القرآن

(صحیح مسلم ج ۲ صـ۳۹۲)

"یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بجز قرآن کے مجھسے اور کوئی چیز نہ لکھو۔"

اِس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ لکھنا عام تھا، اور بہت سے لوگ اس کو جانتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ایک طریقہ جاری ہو گیا تھا کہ لوگ قرآن مجید کو آنحضرت صلعم کے بولنے پر لکھا کرتے تھے۔

(۴) صحیح بخاری میں ہے:-

اکتبوا لی من تلفظ بالاسلام۔

(صحیح بخاری ج ۲ صـ۱۱۳)

"یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے واسطے اُن لوگوں کے نام لکھ دو جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے۔"

(۵) تاریخی واقعہ مندرجہ طبقات ابن سعد جلد دوم صـ۱۲ کہ اسیرانِ بدر جو فدیہ نہ دے سکتے تھے، اُن کی رہائی کی یہ شرط لگائی گئی کہ اُن میں کا ہر شخص مسلمانوں کے دس دس لڑکوں کو لکھنا سکھا دے۔

(۶) فقال الا تعلمین هٰذہ رقیة النملة کما علمتها الکتابة

(ج ۲ صـ۱۱)

"یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شفاء بنت عبداللہ سے فرمایا کہ تو نے حفصہ کو چیونٹیوں کے کاٹنے کا جھاڑنا کیوں نہ بتلایا جیسا کہ تو ان کو لکھنا سکھا چکی ہے۔"

اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتیں بھی لکھنا جانتی تھیں

(ب) اس دور میں کاغذ کی دست یابی خود قرآن مجید سے ثابت ہے ارشاد ہے:-

ولو نزّلنا علیك كتابًا فی قرطاس فلمسوہ بایدیهم لقال الّذین

"یعنی اگر ہم آپ کے اوپر کوئی کتاب کاغذ پر لکھی ہوئی نازل کرتے، اور لوگ اُس کو چھوتے تو کفّار یہ کہدیتے کہ یہ تو کھُلا ہوا

كفروا ان هذا الا سحر مبين — جادو ہے"

غرض کاغذ کی دستیابی میں کوئی شبہ نہیں رہجاتا ہے، یہ ہوسکتا ہے کہ کاغذ عام طور پر دستیاب نہ ہوتا رہا ہو۔ لیکن اسکی قائم مقام کوئی اور چیز مثلاً چمڑا یا اونٹ کی ہڈی وغیرہ آسانی سے ملجاتی تھی۔ چنانچہ چمڑے کا استعمال زمانۂ جاہلیت کی شاعری میں مذکور ہے۔ جیسا کہ مرقش اکبر کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

الدار قفر والرسوم کما — "یعنی معشوق کا مکان ویران پڑا ہے لیکن نشانات
رقش فی ظهر الادیم قلم — ایسے نمایاں ہیں جیسے چمڑے پر قلم نقش بناتا ہو"

غرض یہ شبہ سے بالاتر حقیقت ہے کہ قرآن مجید کتابی صورت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب ہوکر لوگوں میں رائج ہوچکا تھا البتہ یہ سوال ہوسکتا ہے کہ آیا موجودہ قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب وہی ہے جو آنحضرت صلعم نے قرار دی تھی؟ اس کا جواب اثبات میں ہے اور اس کے حسب ذیل چار دلائل ہیں :۔

(۱) سب سے مقدم اور سب سے زیادہ مضبوط یہ دلیل ہے کہ قرآن مجید کی نقل بذریعہ تواتر ہے، یعنی ہر زمانہ میں ایک ایسی بڑی جماعت نے اپنے بعد والوں کو قرآن مجید پہنچایا ہے، جس کے افراد مختلف نسلوں اور مختلف جگہوں کے لوگ تھے، جو ایک دوسرے سے طویل مسافت پر بستے تھے، اور پھر مختلف زمانوں میں تھے، اور عقل کے نزدیک غیر ممکن ہے کہ اس اختلاف نسل اور اختلاف زمان و مکان کے باوجود سب لوگ کسی جھوٹ کو پھیلانے پر متفق ہوجائیں، تواتر کو قرآن مجید کے ساتھ اتنا ربط ہے کہ قرآن مجید کی تعریف ہی بلا استثناء تمام اسلامی فرقوں میں یہ قرار پائی ہے، کہ قرآن اس کتاب کا نام ہے جو دو دفتیوں کے اندر بنقل تواتر چلی آرہی ہے علم اصول فقہ کی رو سے تواتر کو وہ قوت حاصل ہے کہ جو خبر احاد سے ہرگز متزلزل نہیں ہوسکتی (خبر احاد تواتر کا مقابل ہے، جس کے معنی انفرادی طور پر نقل کے ہیں۔) بھلا ہے اس خبر احاد کو کتنی بڑی طاقت و اعتبار حاصل ہو۔

قرآن مجید کے ذریعے تواتر نقل کا بیان درج ذیل ہے :۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر چونکہ تنہا بلاشرکت غیر نازل فرمایا تھا، اس لئے تنہا آپ ہی کو اس کا حق تھا کہ خود زبان مبارک سے بولکر ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ اس کو جمع کریں اور لکھوائیں، اور آپ نے ایسا ہی کیا، اسی طرح مومنین کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کا حق بھی اپنی دی ہوئی ترتیب کے ساتھ تنہا آپ ہی کو تھا، چنانچہ آپ لوگوں کو اس کے پڑھنے اور یاد کرنے کی ترغیب دلاتے تھے۔ جس کی بکثرت حدیثیں موجود ہیں، مگر بنظر اختصار یہاں صرف ایک حدیث کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے :۔

مثل الذی یقرء القرآن — "یعنی جو شخص قرآن کو پڑھتا ہے ایسی صورت
وھو حافظ له مع السفرة — سے کہ اس کا حافظ بھی ہو تو ایسا شخص
الکرام۔ — با عظمت فرشتوں کے ساتھ ہوگا"

ان ترغیبات کے سوا ایک اور بڑی وجہ قرآن مجید کے یاد کرنے اور پڑھنے کی یہ ہے کہ پنجوقتہ نماز میں اسکی تلاوت فرض ہے، اور عہد رسالت میں ہر مومن کے لئے لازمی تھا کہ وہ اپنے سینے میں اس وقت تک کی نازل شدہ وحی کو محفوظ رکھے جو رسول اللہ صلعم کی دی ہوئی ترتیب پر ہو۔ چنانچہ ہر مسلمان اس بات کی انتہائی کوشش کرتا تھا کہ وہ براہ راست آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے قرآن کو حاصل کرے، اگر کتابت نہ جانتا ہو، تو محض حفظ کے لئے ورنہ حفظ و تحریر دونوں کے لئے رسول اللہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے کے بعد ان سے فرمائش کرتے تھے، کہ وہ آپ کے سامنے اس کو پڑھیں، اور جب لوگ پڑھتے تو آپ اس کو سنتے۔

یہ تو خود قرآن سے ثابت ہے کہ لوگ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔

یعلمھم الکتاب والحکمة ۔ "یہ پیغمبر لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں"

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ :۔

انی اخذت من فی رسول — "یعنی میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
رسول اللہ بضعًا وسبعین — کی زبان مبارک سے تقریباً اناسی سورتیں
سورة (ج ۳ ص ۱۴۱) — یاد کیں"

اس حدیث میں پورے قرآن کی تفصیل مذکور نہیں ہے لیکن ابن مسعودؓ کے آنحضرت صلعم سے پورا قرآن حاصل کرنے کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں، ان میں سب سے زیادہ قوی یہ ہے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم :

نے معلّم القرآن مقرر فرمایا اور ان کا نام سب سے پہلے رکھا، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمائش کر کے اُن سے قرآن سُنتے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے:۔

قال لی رسول اللہ اقرأ علی القرآن فقلت أأقرأ علیک وعلیک انزل قال انی اشتھی ان اسمعه من غیری فقرأت النساء۔

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ مجھ کو قرآن پڑھ کر سناؤ۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو پڑھ کر سناؤں درآنحالیکہ وہ آپ ہی پر نازل ہوا ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔ میں دوسرے لوگوں سے سُننے کی خواہش رکھتا ہوں اس پر میں نے سورۂ نساء تلاوت کی۔"

(صحیح مسلم ج ۱ صـ ۲۷۱)

اس طریقے پر صحابہ کرام کی اکثریت قرآن مجید کے حفظ و تعلیم میں مشغول تھی، جن میں خلفائے اربعہ تقدم کا حق رکھتے تھے۔ کیونکہ ان حضرات کو ہر اس چیز کے ساتھ غایت درجہ کا شوق اور غیر معمولی توغل تھا۔ جو دین سے تعلق رکھتی تھی، مندرجہ ذیل واقعات اسکی شہادت دیتے ہیں:۔

۱۔ (الف) حضرت ابو بکرؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ "من یعمل سوءً یجز بہ" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اے ابو بکر جو آیت نازل ہوئی ہے، کیا وہ تمھیں نہ پڑھاؤں" میں نے کہا، ہاں، تو وہ آپ نے مجھے پڑھائی۔ (ترمذی ج ۲ صـ ۱۲۹)

(ب) استدل الامام ابوالحسن الاشعری (المتوفی ۳۲۴ھ) علی حفظہ القرآن بدلیل لایرد وھو انہ قال یؤم القوم اقرأھم لکتاب اللہ واکثرھم قرأناً وتواتر عنہ انہ قدمہ للامامۃ (اتقان صـ ۲۱۶)

"یعنی امام ابوالحسن اشعری نے حضرت ابو بکرؓ کے حافظ قرآن ہونے پر ایک ایسی دلیل پیش کی ہے جو کہ رد نہیں کیجا سکتی اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ لوگوں کو امامت اس شخص کی کرنی چاہیئے جو قرآن کا قاری ہونیکے اعتبار سے ان سب میں بہتر ہو، اور جس کے سینے میں قرآن سب سے زیادہ ہو۔" اور یہ بات بتواتر ثابت ہے کہ آپ نے حضرت ابو بکرؓ کو امامت کیلئے آگے بڑھایا۔

یہ ہدایت اور اس کے بعد آپ کا فعل جو بذریعہ تواتر ثابت ہے کہ آپ نے حضرت ابو بکرؓ کو امامت کے لئے آگے بڑھایا، ایک بہت مضبوط دلیل ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قال ابوالعالیۃ قرأت القرآن علی عمر اربع مرات، (مفتاح السعادۃ ج ۱ صـ ۳۴۹)

"یعنی ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ میں نے قرآن مجید کا دور حضرت عمرؓ کے روبرو چار مرتبہ کیا۔"

۳۔ کان عثمان یختم القرآن فی رکعۃ واحدۃ۔

"یعنی حضرت عثمانؓ ایک ہی رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔"

(استیعاب ج ۲ صـ ۴۴۹)

۴۔ عن ابی عبدالرحمن السلمی قال ما رأیت اقرأ من علیؓ۔

"یعنی ابو عبدالرحمن السلمی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے بڑھ کر کوئی قرآن کا قاری نہیں دیکھا۔"

(استیعاب ج ۲ صـ ۴۷۶)

بہر حال سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے قرآن مجید، کو براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا، جن میں بہت سے ایسے حضرات ہیں، جو خصوصیت کے ساتھ اس میں شغف رکھتے تھے، اور یہ لوگ بطور معلّم لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لئے مقرر ہوئے، اُن میں سے چار معلّموں کا تقرر صحیح بخاری جلد سوم صـ ۱۴۱ و صحیح مسلم جلد دوم صـ ۲۵۲، اور ترمذی جلد دوم صـ ۲۲۲ سے ثابت ہے، ان سب کتابوں میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ ابن مسعودؓ، سالمؓ، معاذ بن جبلؓ اور اُبی ابن کعبؓ کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لئے مقرر فرمایا۔

ان چاروں اصحاب نے بعض دوسرے صحابہ کے ساتھ جو اسی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے تھے (کیونکہ چار کی تعداد ناکافی ہے) بے شمار اشخاص کو عہد نبوی میں اور آپ کے بعد مختلف مقامات پر قرآن مجید کی تعلیم دی۔ یہ امور حسب ذیل واقعات سے واضح ہوتے ہیں:۔

۵۔ عن عبادۃ بن الصامت کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یشغل فاذا

"یعنی عبادہ بن الصامتؓ کہتے ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشغول ہوتے اور کوئی آدمی ہجرت کر کے آتا، تو آپ

قدم الرجل مهاجرًا — اُس کو ہم انصار میں سے کسی کے سپرد
دفعہ الیٰ —— — کر دیتے کہ اُس کو قرآن مجید
رجل منا یعلمہ القرآن۔ — پڑھا وے۔"

(کنز العمال ج ۱ ص ۲۳۱)

۲- استیعاب جلد اول ص ۳۶۹ میں ہے کہ آپ نے قبائل قارہ اور عضل کو قرآن پڑھانے کے لئے چھ اصحاب مقرر فرمائے۔ اصل عبارت یہ ہے:-

"النفر الستۃ الذین بعثھم رسول اللہ الیٰ رھط من عضل والقارۃ فی سنۃ ثلاث من الھجرۃ یفقھوھم فی الدین ویعلموھم القرآن وھم عاصم ابن ثابت و مرثد ابن ابی مرثد و خبیب ابن عدی وخالد ابن البکیر و زید ابن الدثنہ وعبد اللہ ابن طارق۔"

۳- سنہ ۱۰ھ میں قبیلہ بنی الحارث کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے واسطے خالد بن ولید کو مقرر فرمایا۔ بعث فیھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خالد ابن الولید الیٰ بنی الحارث —— علمھم کتاب اللہ۔ (طبری ج سوم ص ۱۵۶ مطبوعہ مصر)

۴- یزید بن ابی سفیان کی درخواست پر جو عہد فاروقی میں شام کے گورنر تھے۔ حضرت عمرؓ نے معاذؓ، عبادہؓ اور ابو درداءؓ کو حمص، دمشق، اور فلسطین میں قرآن شریف کی تعلیم کے لئے روانہ فرمایا۔ اس قسم کے تقررات کی شہادت اور روایتوں سے بھی ملتی ہے جن کی تفصیل تطویل کا باعث ہوگی۔

۵- طبقات القراء ذہبی میں ہے:

قال سوید ابن عبد العزیز — "یعنی حضرت ابو الدرداءؓ جب
کان ابو الدرداء اذا صلی — صبح کی نماز سے فارغ ہوتے، تو
الغداۃ فی جامع دمشق — دس دس آدمیوں کی جدا جدا
اجتمع الناس للقراءۃ — جماعت قائم کرتے،
علیہ فکان یجعلھم عشرۃ — ایک بار تمام طلبہ کو شمار
عشرۃ وعن مسلم بن — کرانے پر معلوم ہوا، کہ یہ
مشکم قال لی ابو الدرداء — ایک وقت ایک ہزار چھ سو
اعدد من یقرء عندی القرآن — (۱۶۰۰) سے زائد طلبہ
فعددھم الفا وستمائۃ — تھے۔"
وینفا (طبقات القراء ص ۶۰۶) — (طبقات القراء ص ۶۰۶)

ان معلمین نے خود تعلیم دینے کے بعد اپنے قائم مقاموں کو مقرر کرنے کا سلسلہ جاری کیا۔ چنانچہ اپنے شاگردوں میں سے چند ممتاز لوگوں کو معلمی کی خدمت پر مامور کردیتے تھے۔ جو نہایت توجہ سے اپنے فرض کو انجام دیتے تھے۔ پھر ان شاگردوں نے اپنے شاگردوں میں سے مستحق طلبہ کو اپنا قائم مقام بنایا۔ اس طرح یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہا۔ جو اب تک جاری ہے۔ اس طریقے سے بے شمار اشخاص کے ذریعے سے، جو مختلف نسلوں اور مختلف مُلکوں اور مختلف زمانوں کے سیکڑوں برس کے اندر دُنیا کے دُور دراز مقامات میں گذرے ہیں قرآن مجید کی روایت ہوتی چلی آئی ہے، اور اسی کا نام تواتر ہے۔ (باقی)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی خدمت میں!

(از مولانا حکیم سید عبدالحیؒ صاحب مرحوم)

(مرسلہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ)

"دارالعلوم کی اس اشاعت میں مولانا حکیم سید عبدالحیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء کے سفری روزنامچہ کا وہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے جو گنگوہ کی حاضری اور حضرت مولانا گنگوہیؒ کی زیارت و ملاقات کے متعلق ہے۔ حکیم صاحب مرحوم نے یہ سفر ۱۳۱۲ھ میں کیا تھا، گویا ان اوراق میں ۶۰ ساٹھ برس پیشتر کی تصویر پیش کی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے وہ حصہ شائع ہو چکا ہے جو دیوبند کی حاضری کے متعلق تھا۔"

(مدیر)

روز پنجشنبہ یازدہم شعبان ۱۳۱۲ھ علی الصبح گاڑی آگئی اور ہم لوگ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر روانہ ہوئے، فنائے سہارنپور تک ملا۔ عنایت اللہ صاحب تھانہ دار منشی و مولوی نظام الدین صاحب بطریق مشایعت کے ساتھ آئے، پھر ہم نے اُن کو باصرار واپس کیا۔ تقریباً ایک بجے ہم انبہٹہ پہونچے، اُتر کر جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی اُس کے بعد حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کی درگاہ پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھا۔ پھر سوار ہو کر عصر کے وقت گنگوہ پہونچے۔ شہر کے باہر ایک محلہ ہے سرائے پیرزادگان اُس میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب کا دولت خانہ ہے، شہر مثل اور قصبوں کے نہایت پُررونق اور آباد ہے بلکہ اس طرف کے جس قدر قصبے دیکھے گئے نہایت ہی آباد ہیں، اودھ کے اکثر شہروں سے زیادہ اُن میں رونق ہے اور اکثر قصبوں میں میونسپلٹی کا انتظام ہے، پانی پت اور دیوبند اور گنگوہ اس بارے میں خاص کر ذکر کے قابل ہیں، بہرحال ہم سرائے پیرزادگان میں آئے، پہلے خانقاہ کے باہر ایک نشست کے مکان میں جو نہایت آراستہ تھا۔ مولانا کے صاحبزادے حکیم مسعود احمد صاحب ملے، ترکی ٹوپی اور قمیض پہنے ہوئے بیٹھے تھے، میں سمجھا کوئی جنٹلمین ہے، اُنہوں نے فرمایا کہ خانقاہ تشریف لے چلئے مولانا وہیں ہیں، ہم خانقاہ آئے، حضرت مولوی صاحب استنجا کر رہے تھے، فرمایا کمرہ میں چلو ہم گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد نکل کر مسجد آئے، نماز پڑھی۔ پھر کمرے میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، بھائی جی[1] مسجد ہی میں رہے۔ مجھ سے پوچھا، کہاں سے آئے ہو؟ میں نے کہا رائے بریلی سے، پوچھا کیوں آئے ہو؟ میں نے کہا، حضور کی زیارت کے واسطے کہنے لگے۔ مطلب کہو، بے مطلب کون کس کی زیارت کرتا ہے؟ میں نے کہا، مطلب کچھ بھی نہیں، یہی مطلب ہے کہ ہم زیارت کو آئے ہیں، کہا، دوسرے کون ہیں؟ میں نے کہا، میرے بھائی ہیں، کہا بڑے بھائی ہیں؟ میں نے کہا بڑے بھائی ہیں، پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ میں نے کہا، مولوی ابوالقاسم صاحب[2] نے آپ کو سلام عرض کیا ہے، کہا مولوی صاحب اچھے ہیں؟ میں نے کہا، جی ہاں، پوچھا کہ وہ رائے بریلی گئے ہیں؟ میں نے کہا، ارادہ تو تھا مگر میرے سامنے تک نہیں گئے تھے کہا، وہ تمہارے کون ہیں؟ میں نے کہا، بھائی ہیں، کہا،

---

[1] "بھائی جی" سے مُراد مصنف کے پھوپھی زاد بھائی سید خلیل الدین احمد صاحب مرحوم
[2] مصنف کے ماموں زاد بھائی مولوی سید ابوالقاسم صاحب ہسوی مرحوم جو حضرت حاجی صاحبؒ اور مولانا گنگوہیؒ سے تعلق و مراسلت رکھتے تھے۔

سگے بھائی ہیں؟ میں نے کہا، ماموں زاد، کہا سگے ماموں کے لڑکے؟ میں نے کہا، جی ہاں، کہا، اُن کی کیا عمر ہے؟ میں نے کہا، پینتیس ۳۵، چھتیس ۳۶ برس کی، کہا ابھی نوعمر ہیں، اس کے بعد میں نے کہا، شیخ عبدالخالق صاحب[1] نے آپ کو سلام کہا ہے، کہا کہ شیخ صاحب اچھے ہیں؟ میں نے کہا، جی ہاں! میں نے کہا کہ مولوی عبدالحکیم صاحب[2] و مولوی محب علی صاحب[3] وغیرہ نے بھی سلام عرض کیا ہے، کہا، سب اچھے ہیں؟ - میں نے کہا، سب اچھے ہیں۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ میں مسلسل بالاولیہ سُننا چاہتا ہوں؟ کہنے لگے کہ اس کی سند خود مجھ کو نہیں ہے، شاہ صاحب کے یہاں جاکر سبق میں شریک ہو گیا تھا، یہ مسلسل بالاولیہ کی سند ہے، یہ مسلسل بالتمر و مسلسل بالمصافحہ کی، تبرک کے واسطے لوگ سند کر لیتے ہیں ورنہ یہ گڑیوں کا کھلونا ہے، مجھ کو کبھی اس کا خیال نہیں ہوا، اصل مقصود کی طرف توجہ رہی، اصل مقصود یہ ہے کہ اشکالِ حدیث کا حل کیا جائے، تعارض دفع کیا جائے، مسئلہ ثابت کیا جائے، تفقہ حاصل ہو، اس کی طرف میرا خیال رہا، حنفی، شافعی جو ہوں اپنا مسئلہ ثابت کریں، مولوی عبدالقیوم صاحب[4] کی زیارت ہوئی سو اُن سے بھی میں نے نہیں عرض کیا، ایک اُستاد نے میرے کسی کو اجازت دی مجھ کو بھی بُلا بھیجا، میں نے اُن سے عُذر کر دیا کہ مجھ کو اس سے کیا حاصل، جو بکار آمد چیز ہے وہ حاصل ہونی چاہئے اگر تم کو جیسی کچھ ناقص ہے وہ سُنا دوں؟ میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد کہا، تم نے کس کس سے پڑھا ہے؟ میں نے سب حال بیان کیا۔ اس کے بعد کہا کہ اب آرام کرو، تھکے ماندے ہو، میں اُٹھ کر باہر آیا، مولوی صاحب بہت ضعیف و نحیف ہیں عمر کی حیثیت سے یہ ضعف نہیں ملتا کیونکہ عمر غالباً ساٹھ ۶۰ سے کچھ ہی متجاوز ہوگی، بڑھاپے کے ایسے آثار نمودار نہیں ہیں بلکہ بیماری کا ضعف ہے، چہرہ سے نحافت معلوم ہوتی ہے، قد بالا اور گورے چٹے آدمی ہیں، داڑھی بھری ہوئی ہے لانبی کھچڑی بال، مزاج میں کسی قدر تند معلوم ہوتے ہیں یا شاید بیماری کی وجہ سے ہو گئے ہوں وقار و ہیبت غالب ہے، سکوت و وقار کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں، کسی کو زیادہ مجال گفتگو کی نہیں ہے، سب چپ سامنے ہر وقت بیٹھے رہتے ہیں، بیماری کی وجہ سے مسجد نہیں آ سکتے تھے مرض نے پھر اعادہ کیا تھا، کل سے مسجد میں تشریف لیجاتے ہیں، نماز پنجوقتہ خود ہی پڑھاتے ہیں، قرأت سے معلوم ہوتا ہے کہ تجوید قرأت میں دخل رکھتے ہیں، بہت صاف اور سیدھی آواز میں پانی پت کے لہجے میں پڑھتے ہیں، مغرب اور عشاء کی نماز حسب معمول خود پڑھائی، جس وقت وہ تشریف لاتے ہیں اُسی وقت تکبیر ہوتی ہے لوگ پہلے سے منتظر رہتے ہیں، مولوی صاحب کے لباس و مکان میں بہت تجمل ہے سب چیزیں آراستہ قرینہ سے رکھی ہوئی، دو دو دیوار گھڑی، قالین کی جانماز اُس پر اونی چوتھی جو پرت بچھی ہوئی چھوٹے چھوٹے تکیے رکھے ہوئے، ایک عمدہ پلنگڑی اُس پر گدہ گدے پر سفید چاندنی، دُلائی نہایت عمدہ۔ الماری میں قرینہ سے کتابیں چُنی ہوئی، چٹائی کا کمرے میں فرش نہایت صاف شفاف۔ بہرحال نہایت تجمل کے ساتھ مگر سادگی کے انداز میں رہتے ہیں، اُسی کمرہ کے سامنے جو حجرہ ہے اُس میں میرے رہنے کا حکم ہوا۔

(۱۲)

روز جمعہ دوازدہم شعبان ۱۳۱۲ھ

صبح کو اُٹھ حوائج ضروری سے فارغ ہوکر خاکسار مولوی صاحب کی خدمت میں گیا۔ اندر کے کمرے میں پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے ایک صاحب اور بیٹھے تھے، کچھ لوگ باہر کے کمرے میں ادب سے سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں بھی باہر ہی بیٹھنے لگا، آواز دے کر کہا، اندر آ جاؤ، میں اور بھائی جی اندر گئے، فرمایا معاف کرنا میں معذور ہوں، میں نے کہا، آپ آرام سے لیٹے رہیں، یہ کہہ کر فرش پر میں بیٹھ گیا، مجھ سے فرمایا کہ کل مسلسل کی نسبت

---

[1] و [2] و [3] یہ سب حضرات مولانا عبدالسلام صاحب ہسوی خلیفہ حضرت شاہ احمد سعید صاحب دہلوی سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا گنگوہی سے عقیدت و اخلاص رکھتے تھے

[4] مفتی عبدالقیوم صاحب بڑھانوی قاضی ریاست بھوپال، حضرت مولانا عبدالحی صاحب بڑھانوی خلیفہ حضرت سید شہید کے صاحبزادے۔ ۱۲

آپ نے کہا تھا، خیر جیسی ہی ناقص ہی یا کامل سُنائے دیتا ہوں :-

الرّاحمون یرحمھم الرحمٰن تبارک وتعالیٰ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السّمآءِ۔ اس کی سند یہ ہے کہ میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے سُنا، میں جب شاہ صاحبؒ کی خدمت میں گیا تو پہلے سے وہ اُن کے یہاں پڑھتے تھے مجھ کو یاد نہیں پہلے بھی اُن سے حدیث کا مذاکرہ مجھ سے ہوا ہے یا نہیں، اُنہوں نے شاہ عبدالغنی صاحب سے سُنا، اور شاہ صاحب نے مولانا محمد اسحٰق صاحب سے اور مولانا محمد اسحٰق صاحب نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے شاہ ولی اللہ صاحب سے، اور اُن کی سند سب کہیں مشہور ہے۔ اس کے بعد مجھ سے کچھ بھوپال کا حال پوچھتے رہے، پھر فرمایا، کہ بھوپال سے کب آئے؟ میں نے کہا، چار پانچ مہینے ہوئے، فرمایا، کچھ درس تدریس ہوتی ہے؟ میں نے کہا، ابتک اتفاق نہیں ہوا لیکن اب ارادہ ہے۔ فرمایا، رائے بریلی میں؟ میں نے کہا، نہیں وہ چھوٹا شہر ہے لکھنؤ میں ہے، فرمایا، کہ لکھنؤ کتنی دُور ہے؟ میں نے کہا کہ بیس کوس ہے دو گھنٹے کا راستہ ہے اور ریل بھی ہے۔ پھر میں نے کہا کہ رائے بریلی ایک چھوٹا شہر ہے اور غریب خانہ خاص شہر میں بھی نہیں ہے بلکہ ایک مقام ہے تکیہ[1] ایک میل کے فاصلے پر، اُس میں ہے، کہنے لگے، آپ تکیہ کے رہنے والے ہیں؟ میں نے عرض کیا، جی ہاں! کہنے لگے، وہ ایک محلہ ہے؟ میں نے کہا، سوادِ شہر میں ہے محلّے کے طور پر نہیں ہے، کہنے لگے، بڑی بستی ہے؟ میں نے کہا، نہیں ہمیں لوگوں کے مکانات ہیں، کہنے لگے پچاس ساٹھ آدمی ہوں گے؟ میں نے کہا، کُل برادری اِتنی ہوگی لیکن اب جو تکیہ میں رہتے ہیں وہ دس بارہ سے زیادہ نہ ہوں گے، کہنے لگے ایک صاحب پہلے آئے تھے، میاں عرفان[2]، حضرت سید صاحب کے بھائی کے نواسے، میں نے عرض کیا، وہ سید صاحب کے نواسے ہیں اور اُن کے بھائی کے پوتے[3]، فرمایا، کہ حضرت کی اولاد صلبی بھی ہے؟ میں نے کہا، جی ہاں، دو صاحبزادیاں تھیں، بڑی صاحبزادی کے جو بیٹے تھے وہ میرے پھوپھا تھے، اُن کا انتقال ہوگیا، دوسری صاحبزادی کے تین بیٹے ہیں مولوی عرفان صاحب، اور اُن کے بھائی۔ اسی طور پر کچھ دیر خاندان کی نسبت باتیں کرتے رہے، پھر اُٹھ کر گھر تشریف لے گئے، تھوڑی دیر کے بعد پھر تشریف لائے، کھانا آیا ہم سب نے کھایا، پھر نماز کی تیاریاں ہوئیں مسجد گئے، مولوی صاحب کے صاحبزادے بھی آئے، ایک صوف کا سیاہ چوغا اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے، پھر مولوی صاحب تشریف لائے، ایک شالی سیاہ عمامہ باندھے ہوئے اور دوہرے انگرکھے اوپر ایک فاختئی رنگ بانات کا کوٹ پہنے ہوئے جس کے اطراف طلائی لیس دو انگل کی ٹکی ہوئی اور لیس کے اوپر انگریزی کلابتو کا نہایت عُمدہ کام، اور آستینوں میں ترنج بنی ہوئی، جب مسجد آئے تو لوگ کھڑے ہونے لگے، فرمایا، بیٹھے رہو، آکر اوّل صف میں ایک جگہ جانماز جو تہی بچھی ہوئی تھی بیٹھ گئے سنت پڑھ کر خود ہی خطبہ پڑھا، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا جمع کیا ہوا، اس کے بعد وہی جو تہی پیش امام کے مصلے پر بچھادی گئی اُس پر نماز پڑھائی، اس کے بعد سنتیں پڑھ کر کمرے میں آئے، باہر کے کمرے میں چارپائی بچھادی گئی تھی اُس پر لیٹ گئے، اور ملنے والے اُس کے گرد فرش پر بیٹھ گئے، ہم بھی جاکر بیٹھے، لوگ اپنی اپنی عرض معروض کرتے رہے وہ لیٹے ہوئے تسبیح پڑھتے جاتے تھے۔ بھائی جی نے بیعت کی استدعا کی سلسلۂ احمدیہ میں، فرمایا، شاہ عبدالخالق صاحب آپ کے قریب ہیں اُن سے بیعت کیجئے! وہ سلسلۂ احمدیہ میں بیعت لیں گے، میں سلسلۂ چشتیہ میں بیعت لیتا ہوں اور میرے یہاں کچھ ہے نہیں آپ کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ بھائی جی نے کہا، میں دخول سلسلہ چاہتا ہوں، فرمایا، کہ

[1] تکیہ کلاں یا دائرۂ شاہ علم اللہ وہ بستی ہے جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی ولادت اور نشو و نما ہوا۔ ۱۲

[2] مولانا سید محمد عرفان بڑے عالم، زاہد اور متبع سنت بزرگ تھے، سید صاحبؒ کے باقیات الصالحات اور یادگار سلف بزرگوں میں تھے، رحمۃ اللہ علیہ ۱۲

[3] سید محمد اسحاق صاحب مرحوم جو سید صاحبؒ کے حقیقی نواسے اور ان کے حقیقی بھائی مولانا سید اسحٰق کے پوتے تھے رحمۃ اللہ علیہم ۱۲

لوگ بیعت کرنے کے بعد پھر کچھ اور آرزو کرتے ہیں تو مجھ کو شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے، شاہ عبدالخالق صاحب، شاہ احمد سعید صاحب کے سلسلۂ احمدیہ میں ہیں، اُن سے بیعت کیجیے، بھائی جی نے کہا، میں سلسلۂ احمدیہ میں حضرت سید صاحب کے سلسلہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں، فرمایا، کہ البتہ اُن کے سلسلہ میں میں داخل تو کر سکتا ہوں ہمارے بڑے میاں صاحب[1] سید صاحبؒ کے مُرید تھے اس کا میں ذمہ دار ہوں کہ اس سلسلہ میں آپ داخل ہو جائیں گے، لیکن اور کچھ فائدہ نہ ہوگا، میرا کام پڑھنا پڑھانا ہے اگر آپ کو صرف دخول سلسلہ مقصود ہو تو بہتر ہے بعد نماز عصر کے، لیکن استخارہ کر لیجیے، بھائی جی نے کہا، میں استخارہ کر چکا ہوں، فرمایا کہ پھر دو رکعت نماز پڑھ کر دعائے استخارہ پڑھیے۔ اس کے بعد میں اُٹھ آیا، عصر کے بعد پھر حاضر ہوا، خود بدولت اندر کے کمرے میں تھے، میں اور بھائی جی باہر کے کمرے میں بیٹھے، دیکھ کر بھائی جی کو اشارہ کیا، آئیے وہ اندر گئے، مجھ سے کہا، آپ، وہیں بیٹھیے، میں بیٹھا رہا، لیکن بسبب قُرب گفتگو سب سُنتا جاتا تھا پہلے بیعت کے مسئلہ پر گفتگو کی اُس کے احکام اور اقسام کا نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور غرض و غایت اُس کی بیان کی، پھر خانوادوں کا ذکر کیا، اُس کے اختلاف کا بیان کیا پھر خطبۂ مسنونہ پڑھ کر بیعت مسنونہ لی، اور توبہ کرائی اس کے بعد ذکر تلقین کیا جب سب مراتب طے ہو گئے تو مجھ کو بُلایا، میں اندر گیا، فرمایا، کہ سب مشائخ طبیب اُمت ہیں اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں کے اعتبار سے طُرق اُنھوں نے رکھے ہیں سب کا مآل ایک ہے اور سب کا خلاصہ اتباعِ سنّت ہے، بعد کو لوگوں نے بدعتیں داخل کی تھیں، اُن کے مجدّد حضرت سیّد صاحب ہوئے، جس کو جس سے عقیدت ہو اُس کے طریقہ میں داخل ہو جائے فائدہ ہوگا، پھر فرمایا کہ مجھ کو حضرت سیّد صاحب کے ساتھ محبّت و عقیدت اعلیٰ درجہ کی ہے۔

میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے پیر شاہ عبدالعزیز صاحب سے بڑھ کر ہیں، باقی خدا جانے کون بڑھ کر ہے، لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہی آتا ہے، میں اپنے قلب کا مختار نہیں ہوں، یہ کچھ خدا کی طرف سے ہے، پھر میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ تو ہی جانے میں مجبور ہوں، شاہ صاحب کے پہلے بھی اس خاندان میں اتباعِ سنت تھا مگر حضرت نے نہایت درجہ کو اتباع کیا، ہندوستان میں نور پھیلا دیا، علماء کہتے ہیں کہ وہی کتابیں اب بھی ہیں لیکن اب خدا جانے کیا بات ہو گئی ہے، جو اُن کی صحبت میں ایک گھڑی بیٹھا اُس میں وہی رنگ آ گیا جس میں زیادہ اتباعِ سنت ہو وہی ولی کامل ہے، میرا تو عقیدہ یہی ہے، کہ سیّد صاحبؒ اپنے پیر سے بڑھ کر ہیں، میں اُن کے دیکھنے والوں میں سے بہت کم لوگوں سے ملا ہوں۔ لیکن انبیہٹہ کے ایک حاجی صاحب تھے، تھے تو وہ بہت کم استعداد لیکن اُن کی عجیب حالت تھی اُن کی صحبت میں بہت رہا ہوں، میرے دادا پیر میاں جی نور محمّد صاحب، حضرت کے مُرید تھے۔ اور اُن کے پیر حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب بھی سیّد صاحب کے مُرید تھے، یہ دو طریقے حضرت کے سلسلہ کے ہیں، مجھ کو سب سے زیادہ حضرت سے محبّت و عقیدت ہے میں اپنے قلب سے مجبور ہوں، یہ اللہ ہی کی طرف سے کوئی بات ہے، اس کے بعد اور لوگ آ گئے اور اپنی اپنی عرض و معروض کرنے لگے، ہم اُٹھ آئے وہاں سے اُٹھ کر مولوی مسعود احمد صاحب سے ملنے گئے انھوں نے نہایت اعزاز و اکرام سے بٹھایا، حالات پوچھتے رہے فرمایا کہ مولوی ابوالقاسم صاحب سے آپ کے کیا قرابت ہے؟ کل حضرت نے بعد مغرب مجھ سے فرمایا تھا کہ مولوی ابوالقاسم صاحب کے بھائی آئے ہیں۔ اس کے بعد بھائی جی نے کچھ اپنی علالتوں کا حال بیان کیا یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہوئی سب اُٹھ آئے، مغرب کی نماز کے بعد پھر مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اندر کے کمرے میں تھے کچھ لوگ باہر بیٹھے تھے، وہیں بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد کھانا آیا، کھانا کھا کر قیام گاہ پر واپس آیا۔ مولوی صاحب بھی نماز پڑھ کر چلے آئے، اب اندر کمرے کے ہیں مولوی صاحب کے اوقات جن کے ہمیشہ وہ پابند رہتے ہیں، یہ ہیں کہ بعد نماز صبح کے حجرے میں چلے جاتے ہیں، اشراق کے بعد خطوط

---

[1] حضرت میاں جی نور محمّد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ، میانجی صاحبؒ اور ان کے شیخ حضرت حاجی عبدالرحیم ولایتیؒ دونوں کو حضرت سیّد صاحبؒ سے براہِ راست بیعت تھی۔

ملاحظہ فرماتے ہیں، خطوط کے دو حصے کئے جاتے ہیں، ایک وہ جو احباب کے ہیں جن میں خیر و عافیت ہوتی ہے یا خیریت دریافت کی جاتی ہے، اُن کے جوابات اُسی وقت تحریر فرماتے ہیں، آٹھ بجے کے بعد درس شروع ہوتا ہے ۱۱ بجے تک اس میں مصروف رہتے ہیں، اس کے بعد کھانا تناول فرما کر قیلولہ کرتے ہیں پھر ظہر کی نماز پڑھتے ہیں، نماز کے بعد خطوط کا دوسرا حصہ یعنی وہ خطوط جو بطور استفتاء کے ہوتے ہیں ملاحظہ فرماتے ہیں اور اُن کے جوابات لکھتے ہیں ۲ بجے تک، دو بجے کے بعد پھر درس شروع ہوتا ہے، اُس میں ۴ بجے تک مصروف رہتے ہیں، چار بجے عصر کی نماز پڑھتے ہیں، پھر باہر نشست فرماتے ہیں اور عام طور پر لوگوں سے ملتے ہیں جس کو جو کچھ کہنا سُننا ہوتا ہے وہ کہتا ہے اور خود بدولت سُنتے ہیں مغرب تک، مغرب کی نماز کے بعد پھر اندر بیٹھتے ہیں خاص خاص لوگ اُس وقت بھی حاضر ہو سکتے ہیں۔

مولوی صاحب کا یہ بھی دستور ہے کہ اوقات درس میں کسی سے گفتگو نہیں فرماتے، اب آجکل بیماری کی وجہ سے درس موقوف ہے، اِس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب بقیۃ السلف ہیں اُن کا وجود باجود مغتنمات میں سے ہے، اس تورع و استقامت کا دوسرا شیخ ان کے سوا اس زمانۂ عالم آشوب میں نظر نہیں آتا علم الٰہی میں جو کوئی ہو اُس کی خبر نہیں، مولوی صاحب کے اوصاف میں سب سے بڑا وصف تورع ہے جو تمام اوصاف کو شامل ہے، کف لسان اور صدق گفتار میں مولوی صاحب ضرب المثل ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے صدقے میں اس روسیاہ کے حال پر رحم فرمائے اس کے دِل کی تاریکی دُور ہو اور کسی قدر چاشنی احسان کی عطا فرمائے ؎

الٰہی عبدک العاصی اتاک
مُقِرّا بالذنوب وقد دعاک

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخٰسرین

شاہا زکرم برمنِ درویش نگر ٭ برحالِ منِ خستہ و دلریش نگر
ہر چند نیم لائق بخشائش تو
برمن منگر برکرم خویش نگر

روز شنبہ سیزدہم (۱۳) شعبان

آج بہت سویرے آنکھ کھلی، کواڑ کھول کر جو دیکھا تو ابھی بہت رات باقی تھی، اور پڑھنے کی آواز آرہی تھی خیال جو کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت تلاوت فرما رہے ہیں یا تہجد میں قرآن پڑھتے ہوں۔ یہ قاصر الہمت پھر آکر لیٹ رہا، کچھ دیر کے بعد اذان ہوئی، اُٹھکر پاخانے گیا، وہاں سے آکر وضو کر کے جماعت میں شریک ہوا۔ بعد نماز کے حضرت مولوی صاحب کے کمرے میں گیا، وہ اندر تھے کچھ لوگ باہر تھے یہ رُوسیاہ باہر ہی بیٹھ گیا، اور اپنی شامتِ اعمال اور خبث باطنی کے انجام کی فکر کرنے لگا افسوس صد ہزار افسوس عُمر کا ایک ربع اس بطالت اور بیہودگی میں گذرا کہ باوجود مُسلمانوں کے بدنام کرنے کے اب تک ایمان خالص اور اسلام کامل کا ایک حصہ بھی نصیب نہیں ہوا، بوالہوی حد سے زیادہ ہے، اور کام کچھ ہو نہیں سکتا، حُب جاہ و پراگندگی باطن ہر وقت مسلط رہتی ہے دیکھئے انجام کیا ہو ع

"سالیکہ نکو است از بہارش پیدا"

جس کی ابتداء بگڑ گئی اُس کے انجام کا خدا حافظ ہے، یہ بھی ایک شامت ہے کہ ان بزرگوں کی خدمت میں پہونچکر اپنی بے استعدادی کی وجہ سے فیض سے محرُوم رہے، ع "زمین شور سنبل برنیارد" جب قلب میں صلاحیت ہی نہیں تو کیا تاثیر ہو سکتی ہے، یہ بھی ایک شامت ہے کہ اِن بزرگوں کی خدمت میں پہونچکر پھر صحبت سے محرُوم رہ جائے، ای اللہ ای ہادی، اے مُرشد تُو ہی اس بے بہرہ کی دستگیری فرما! اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت، ولا راد لما قضیت، استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ۔

تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولنا سلمہم اللہ تعالےٰ برآمد ہوئے اور گھر تشریف لے گئے، بھائی جی کا ارادہ آج ہی روانگی کا ہے اور یہ رُوسیاہ بھی اُن کی رفاقت میں آج ہی جانے والا ہے، اِس وجہ سے بڑھ کر عرض کیا کہ میں رخصت ہونا چاہتا ہوں، فرمایا، کھانا کھا کر جانا، پھر دوبارہ عرض کرنا داخل گستاخی سمجھکر چُپ ہو گیا،

اس کے بعد بعض بزرگ وہیں بیٹھ گئے یہ خاکسار بھی بیٹھ گیا، سید صاحبؒ کے فضائل و خصائص بیان کرنے لگے، اُن میں سے ایک نے کہا کہ "سب فضیلتیں ایک طرف اور یہ فضیلت ایک طرف کہ سید صاحبؒ کے مُریدوں میں اُن کا رنگ ایسا جم جاتا تھا کہ پھر کسی طرح اس میں تغیر نہیں آتا تھا، بلا کی تاثیر تھی، ایک مرتبہ جس نے اُن کی صحبت اختیار کر لی وہ پھر اُنھیں کا دم بھرنے لگتا تھا، مرد تو مرد عورتیں بھی جنھوں نے سواءِ ایکبار کے کبھی اُن کی زیارت نہیں کی، وہ ایسی پختہ ہو جاتی تھیں کہ پھر کسی طرح اپنے خیالات سے نہیں ٹلتی تھیں وہ کہتے تھے کہ میری والدہ سید صاحبؒ کی مُرید تھیں لیکن اس طور پر کہ جب نانوتہ سید صاحب تشریف لے گئے اور عورتوں نے مُرید ہونا چاہا تو ایک مکان میں وہ سب جمع کر دی گئیں، سید صاحبؒ تشریف لائے، دروازے سے پگڑی پھینک دی سبھوں نے اُس کو تھام لیا اور توبہ کر لی، اُن عورتوں پر اچھی طرح وعظ و پند کا بھی اثر نہیں پڑ سکا۔ لیکن باوجود اس کے میری والدہ عقائدِ صحیحہ پر ایسی پختہ تھیں کہ اُن پر کسی کا جادو نہیں چل سکا، پیرزادوں میں اُن کی شادی ہوئی اور گنگوہ کے پیرزادے نہایت سخت، وہ سب ایک طرف بلکہ والد ایک طرف اور وہ ایک طرف، لیکن اگر اثر پڑا ہے تو انھیں کا دوسروں پر پڑا ہے اُن پر کسی کا اثر نہیں پڑا یہ بھی بیان کیا کہ جب سید صاحبؒ کاندھلہ تشریف لے گئے تو اُس وقت مولوی ابو الحسن[1] صاحب سن رسیدہ تھے اُن کے صاحبزادے مولوی نور الحسن آٹھ دس برس کے تھے اور زیور پہنے ہوئے تھے، جب سید صاحبؒ تشریف لائے تو صاحبزادہ صاحب آ کر بیٹھ گئے، سید صاحبؒ نے فرمایا، مولوی صاحب یہ کون ہیں؟ انھوں نے فرمایا، بندہ زادہ، فرمایا، کہ یہ کیا پہنے ہوئے ہیں کیا یہ جائز ہے؟ کچھ ایسی تقریر فرمائی کہ وہ شرمندہ ہوئے اور اُسی وقت انھوں نے اُس کو اُتروا ڈالا، عورتوں نے بہت دُھند مچایا کہ یہ نئے مولوی کہاں سے آئے ہیں؟ ہمارے مولویوں نے اب تک کبھی منع نہیں کیا، کیا اب نئی کتابیں بنی ہیں جو پہلے تھیں وہی اب بھی ہیں؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ واقعی کتابیں تو وہی ہیں جو پہلے تھیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ ہم کو کیا ہو گیا تھا، اس قسم کے اور بھی قصص بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد مولوی رشید احمد صاحبؒ کا ذکر آیا، سب نے بیان کیا کہ اس شدت مرض میں بھی رخصت پر عمل نہیں کیا، مرض کی یہ حالت تھی کہ ذرا سی نقل و حرکت میں دست آ جاتا تھا، کسی نے پیر چھُوا اور حاجت ہوئی، کھڑے ہوئے اور دست آیا، دن بھر میں ستر ستر دست آتے تھے، مگر باوجود اس کے کبھی چارپائی پر یا کپڑے میں نہیں کیا، ہمیشہ چوکی پر تشریف لیجاتے تھے، حالانکہ اُٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے، لوگوں نے ہر چند سمجھایا مگر نہیں مانے دوسرے کبھی بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی، فرض ہمیشہ کھڑے ہو کر پڑھتے رہے، جب لوگ زیادہ سمجھاتے تھے تو کہتے تھے کہ "جب تک کھڑا ہوا جاتا ہے بیٹھ کر نہ پڑھوں گا چاہے گر ہی کیوں نہ پڑوں؟ مرض سے اِدھر افاقہ ہوا اور مسجد جانے لگے"

تھوڑی دیر کے بعد مولٰنا گھر سے تشریف لائے ہم لوگ جا کر پاس بیٹھے، ۹ بجے تک بیٹھے رہے، ۹ بجے کے کھانا آیا۔ فرمایا، کہ کھانا کھالو، کھانا کھا کر رخصت ہوئے، مغرب کے بعد سہارنپور پہونچے +

[1] جناب مفتی الٰہی بخش صاحب (تلمیذ رشید حضرت شاہ عبد العزیزؒ علیہ الرحمۃ و خلیفہ حضرت سید احمد رحمۃ اللہ علیہ) کے صاحبزادے اور مثنوی گلزار ابراہیم" کے مصنف۔ ۱۲ +

تیسری قسط:۔

ایمان اور کفر کا معیار

"قرآن وحدیث کی روشنی میں"

(مولٰنا خالد محمود ایم، اے)

ایمان اور اسلام کی ان تفصیلات کے بعد اِس لئے کہ "الاشیاء تعرف باضدادھا"، کفر سے متعلق بھی کچھ تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ لغت عرب میں کفر پردے کو کہتے ہیں کسان کو بھی اس لئے کہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے 'کافر' کہتے ہیں۔ (رد المحتار جلد ۳ باب المرتد ص ۳۹۲) اسی طرح سیاہ رات کو بھی، اس لئے کہ وہ اپنی تاریکی میں دنیا کو ڈھانپ لیتی ہے 'کافر' کہتے ہیں، (رد المحتار جلد ۳ کتاب الایمان ص ۶۱) پھل کے غلاف کو بھی اسی اصل کی وجہ سے کافور کہا گیا ہے (بیضاوی جلد ا ص ۴۲ مصر)۔ عرب اس وقت جب کوئی درع کے اوپر کپڑا پہن لے، کہتے ہیں،۔ کفر درعہ" اس نے اپنی درع کو چھپالیا (فتح جلد ا ص ۲۳۸) اسی طرح کفر ستر نعمت کو بھی کہتے ہیں اور اس کی ضد شکر ہے، چنانچہ قرآن پاک میں بھی کئی مقامات پر اسے شکر کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہے:۔

فاذکرونی اذکرکم واشکروالی ولاتکفرون (پ ۲۔ ع ۲)
"مجھے یاد کرتے رہو میں تمہیں یاد رکھونگا میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو" (پ ۲ ع ۲)

لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید۔ (پ ۱۳)
"اور اگر تم شکر کروگے تو میں تمہاری نعمت زیادہ کردونگا اور اگر ناشکری کروگے تو یہ سمجھ لو کہ میرا عذاب بڑا سخت ہے"

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اریت النار فاذا اکثر اھلھا النساء یکفرن قیل ایکفرن باللہ قال یکفرن العشیر ویکفرن الاحسان۔ الحدیث (صحیح بخاری ج ا ص ۳۹)
"حضرت ابن عباس رضی کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے جہنم دکھایا گیا پس کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں عورتیں (مردوں سے) زیادہ ہیں وہ کفر کیا کرتی تھیں؟ آپ سے عرض کی گئی کہ کیا وہ دین کا کفر کرتی ہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں، وہ کنبے کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔"

اور چونکہ انکار اسی چیز کا ہوتا ہے جو پوشیدہ اور چھپی ہوئی ہو اِس لئے لفظ کفر پھر انکار کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ فیصلے کے دن جب حساب کتاب ہوچکے گا تو ابلیس بھی اپنے ساتھیوں کو کہے گا۔

انی کفرت بما اشرکتمون من قبل۔ (پ ۱۳)
"میں منکر ہوتا ہوں اس سے جو قبل ازیں تم نے مجھے شریک بنا رکھا تھا"

جب لفظ کفر انکار کے معنوں میں ہو تو یہ یقین اور تصدیق کا مقابل ہے اِس صورت میں یہ لفظ ایمان کی ضد بنا پس اطلاق شرعی میں بھی کفر اور ایمان ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال ہوں گے۔

(۱) ومن لم یؤمن باللہ ورسولہ فانا اعتدنا للکافرین سعیرا۔ (پ ۲۶ ع ۲)
"اور جو کوئی اللہ تعالے اور اس کے پیغمبر پر ایمان نہیں رکھتا تو ہم نے ایسے کافروں کے لئے دہکتا جہنم تیار کر رکھا ہے"

(۲) ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان۔ الآیۃ (پ ۲۶)
"اور لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنادیا اور اُسے تمہارے دلوں میں مزین کردیا اور کفر وفسوق اور نافرمانی کو تمہارے لئے قابلِ نفرت بنادیا۔"

(۳) ھُوالذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مؤمن۔ (پ ۲۸ تغابن)

"وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر کوئی تم میں سے کافر ہے اور کوئی مومن ۔"

(۴) فمن شاء فلیومن و من شاء فلیکفر (پ ۱۵)

"پس جو چاہے ایمان لے آئے اور جو کوئی چاہے کفر اختیار کرے ۔"

پس جبکہ شرع میں ایمان اور کفر ایک دوسرے کی نقیض ہیں اور ایمان کے شرعی معنی یہ ہیں کہ جملہ تعلیماتِ محمدیہ جن کا آپ کی تعلیم ہونا قطع ویقین سے ثابت ہو، بہ مسائل کلامیہ میں اعتقاد اور مسائل فقہیہ میں تسلیم ہو، تو کفر کے شرعی معنی بھی متعین ہو گئے کہ تعلیمات محمدیہ میں سے کسی ایک قطعی اور یقینی تعلیم کا انکار یا الحاد بھی اسلام سے نکال کر کفر کی حدود میں داخل کر دیتا ہے ۔ درمختار میں ہے ۔

"الکفر لغۃً الستر وشرعاً تکذیبہ صلی اللہ علیہ وسلم فی شیءٍ مما جاء بہ من الدین ضرورۃ والفاظہ تعرف فی الفتاوی" (درمختار برحاشیہ شامی جلد ۳ صـ۳۹۲)

"کفر لغت عرب میں پردہ ڈالنے کو کہتے ہیں اور شریعت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی جملہ ضروریات دین میں سے کسی ایک کے انکار کو بھی کفر کہا جاتا ہے جن الفاظ کے ساتھ یہ کفر متحقق ہوتا ہے وہ کتب فتاوی سے معلوم کئے جا سکتے ہیں ۔" (درمختار ج ۳ صـ۳۹۲)

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایمان میں جملہ تعلیمات محمدیہ پر یقین رکھنے کی قید ہے جو کہ موجبہ کلیہ ہے اور کفر میں جمیع کی قید نہیں اس لئے کہ موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ جزئیہ ہی ہوتی ہے یعنی شرائع اسلام اور ضروریات دین میں سے کسی ایک بات کا انکار بھی مکمل کفر ہی ہے ۔

مثلاً "کل انسان حیوان ہیں" ایک ایسا قضیہ ہے جو موجبہ کلیہ یعنی سب انسانوں کو ضروری طور پر شامل ہے، اب اگر کسی انسان کا بھی حیوان نہ ہونا ثابت ہو جائے تو یہ سارا قضیہ غلط ہو جائے گا، اور اس کے غلط ہونے کے لئے یہ ضروری نہ ہوگا کہ ہر ایک ایک انسان کا حیوان نہ ہونا ثابت ہو جائے، اس لئے کہ موجبہ کلیہ کے ابطال کے لئے فقط سالبہ جزئیہ ہی کافی ہوتا ہے۔

اسی طرح ایمان کے لئے کل تعلیمات محمدیہ کو ماننا ضروری ہے اب اگر کسی ایک ایسے امر کا بھی انکار کر دیا جائے جو یقینی طور پر آپ کی تعلیم ہو تو ایمان کا موجبہ کلیہ یقینی طور پر باطل ہو جائے گا اور اس کی نقیض "سالبہ جزئیہ" کفر کی صورت میں جلوہ گری کرے گی۔ پس یاد رکھنا چاہیئے کہ ایمان موجبہ کلیہ ہے اور اس کے مقابل میں کفر سالبہ کلیہ کا نام نہیں بلکہ سالبہ جزئیہ کا مصداق ہے ۔

اس تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جو لوگ "حضور کے آخری نبی ہونے" کے منکروں کو کلمہ پڑھتے، نمازیں پڑھتے اور اسلام کا نام لیتے دیکھ کر مسلمان سمجھنے لگتے ہیں وہ سخت غلطی میں ہیں، اور رُوحِ اسلام سے قطعاً بے بہرہ ہیں وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اسلام اس امر کا نام نہیں کہ اسلام کی کچھ یا بیشتر باتیں پائی جاتی ہوں، بلکہ اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں کفر کی کوئی بات نہ ہو۔ پس کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اس میں اسلام کی کسی ایک بات کا بھی انکار نہ پایا جاتا ہو۔ چنانچہ رب العزت نے بھی "ایمان بالبعض" اور "کفر بالبعض" کو خالص اور مکمل کفر ہی قرار دیا ہے، ایمان شرعی ایک شئی بسیط ہے جو ہوگا تو پورا ہوگا، اور نہ ہوگا تو کچھ بھی نہ ہوگا اس کا تجزیہ محال شرعی ہے اور نہ یہ زیادت اور نقصان کو برداشت کر سکتا ہے ۔

قال اللہ تعالیٰ :۔

ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعضٍ ونکفر ببعضٍ ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا ۝ اولٰئک ھم الکٰفرون حقا واعتدنا للکافرین عذابا مھینا ۝ (پارہ ۶)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق کر دیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے، اور چاہتے ہیں کہ کوئی درمیانی راہ نکال لیں ۔ یہی وہ لوگ ہیں جو پکے کافر ہیں ۔ اور ہم نے ان کافروں کے لئے ذلت والا عذاب تیار کر رکھا ہے ۔" (پارہ ۶)

اس ارشادِ ربانی نے واضح کر دیا کہ اللہ کو ماننا اور اس کے رسولوں کو نہ ماننا، یا بعض کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا کل اسلام کا نہ ماننا سمجھا جائے گا بعض کا انکار کل کے انکار کی طرح کفر خالص ہوگا۔

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:۔

فالکافر ببعض ذٰلک کالکافر بالکل فی الضلال ج ا ص۱۳۰ مصر — "پس بعض کا انکار کرنے والا کل کے انکار کرنے والے کا حکم رکھے گا۔"

ان حقائق سے واضح ہے کہ کفر کے معنی ہی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قطعی تعلیمات میں بعض کو نہ ماننا کیونکہ اسلام کی بعض باتیں تو دنیا کے ہر مذہب میں نہیں بلکہ ہر ایک ایک فرد میں پائی جاتی ہیں۔ پس اگر کفر کے لئے کل ضروریاتِ دین کا انکار ضروری ہو تو دنیا میں کوئی کافر نہ ہو سکتا ہے نہ ہے اور نہ ہوگا۔ حضرت علامہ تفتازانی رح فرماتے ہیں:۔

(المبحث السادس الکفر) وھو معنی عدم تصدیق النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی بعض ما علم مجیئہ بہ بالضرورۃ۔ (شرح مقاصد جلد ۲ ص۲۶۷ مصر)

"کفر کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان امور میں سے جن کا آنحضرت کی تعلیمات ہونا ضروری طور پر ثابت ہو چکا ہو۔ بعض کی تصدیق نہ کی جائے۔"

قرآن کہتا ہے:۔

ولقد قالوا کلمۃ الکفر وکفروا بعد اسلامھم (پارہ ۱۵)

"اور یقیناً انہوں نے کفر کا ایک کلمہ کہا اور مسلمان ہونے کے بعد[1] پھر کافر ہو گئے۔"

پس واضح ہوا کہ کفر کی صفوں میں داخل ہونے کے لئے اسلام کی ہر ایک بات کا انکار ضروری نہیں بلکہ کسی ایک یقینی بات کا انکار بھی دائرۂ ایمان سے نکال کر کفر کی حدود میں داخل کر دیتا ہے۔

[1] جبکہ دوسری آیات میں کفر کا مقابلہ عموماً ایمان سے کیا گیا ہے یہاں کفر بمقابلہ اسلام وارد ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شریعت کی نگاہ میں ایمان اور اسلام کی حقیقت ایک ہے اور فرق صرف اعتباری ہے۔
"لا یعقل بحسب الشرع مؤمن لیس بمسلم او مسلم لیس بمؤمن" (شرح مقاصد جلد ۲ ص۲۶۷)

قرآن کی نگاہ میں ہر وہ شخص کافر ہے جس نے اپنے اختیار سے ایک بھی کلمۂ کفر کہا خواہ باقی جملہ تعلیمات محمدیہ پر ایمان ہی کیوں نہ رکھتا ہو شریعتِ اسلامیہ میں دینِ محمدی کے کسی ایک قطعی جزو کا انکار یا کل اسلام کا انکار دونوں ہم معنی ہیں، جب خدا اور اس کے پیغمبر برحق کو مان لیا تو اس کے معنی یہی ہیں کہ ہر خبر، ہر امر اور ہر نہی میں ان کی تصدیق کرنا اور ان کو سچا سمجھنا یہ کیا ماننا ہوا کہ بعض امور میں تصدیق اور بعض میں عدم تصدیق، ایسا ماننا تو اس کے سوا کہ دنیا و آخرت میں رسوائی ہو اور کیا حقیقت رکھتا ہے۔

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض ج فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا خزی فی الحیوۃ الدنیا و یوم القیمۃ یردون الی اشد العذاب ط وما اللہ بغافل عما تعملون ط (پ۱)

"کیا تم کتاب کے بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض پر نہیں رکھتے سو جو تم میں سے ایسی حرکت کرے اس کی سزا سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا میں رسوائی اور قیامت کو بہت بڑا عذاب، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں۔"

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس آیت کے اصالۃً مخاطب اہلِ کتاب ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ وہ علی الاعلان اس بات کا اقرار نہیں کرتے تھے کہ ہم بعض توراۃ پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ کل توراۃ پر دعوتِ ایمان رکھتے ہوئے بعض احکام تورات کے ساتھ "کفرِ انکار" نہیں "کفرِ الحاد" کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں شبۂ تاویل کا فائدہ نہ دیتے ہوئے کافر بالبعض ہونے کے جرم میں کافر بالکل اور جہنمی قرار دیا ہے۔

یہاں تک تو قرآن پاک کی رو سے کفر کے شرعی معنوں کا بیان تھا، اب آیئے اور دربارِ رسالت سے حدیث کی روشنی میں اس کی تصدیق حاصل کیجئے:۔

پیغمبرِ اسلام کے نزدیک کفر کی حقیقت

مسیلمہ کذاب جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا حضور تاجدارِ ختمِ نبوت کی نبوت اور شریعت کو تسلیم کرتا تھا اس کے

ساتھ ہی نمازیں بھی پڑھتے تھے اور ان کی اذانوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعلان بھی برابر جاری رہتا تھا۔ امام طبری مسیلمہ کے ذکر میں لکھتے ہیں :-

"کان یؤذن للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ویشہد فی الاذان ان محمداً رسول اللہ، وکان الذی یؤذن لہ عبد اللہ بن النواحة وکان الذی یقیم لہ حجیر بن عمیر ۔۔۔ الخ"

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اذان کہی جاتی تھی اور اذان میں برابر 'اشہد ان محمداً رسول اللہ' کی گواہی دی جاتی تھی اور مسیلمہ کا مؤذن عبد اللہ بن نواحہ تھا، اور اقامت حجیر بن عمیر کہتا تھا۔"

(تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۴۴)

مگر جب اسی مسیلمہ کے ایلچی جن میں یہ عبد اللہ بن نواحہ بھی موجود تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے پوچھا :-

[illegible] انتما ـــــ ؟ مسیلمہ کے دعوے نبوت کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے؟

انہوں نے جواب دیا :-

نقول کما قال ـــــ جو حضرت مسیلمہ فرماتے ہیں، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

اس پر تاجدار ختم نبوت نے ارشاد فرمایا :-

"لولا ان الرسل لا تقتل لضربت اعناقکما۔"

"اگر ایلچیوں کا قتل کرنا خلاف اصول نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن اڑا دیتا۔"

(سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۳۸)

بعض دوسری روایات میں ہے :-

"لانهما ارتدا عن الاسلام۔"

"آنحضرت نے ان کے لئے سزائے قتل اس لئے تجویز کی کہ وہ ایک جھوٹی نبوت کا اقرار کرکے کل اسلام سے مرتد ہو گئے تھے۔"

اس ارشاد نبوی نے بھی وضاحت کر دی کہ کفر میں داخل ہونے کیلئے سارے اسلام کا انکار ضروری نہیں بلکہ کفر کی ایک بات بھی مرتد بنا دیتی ہے

اور یہ بھی ثابت ہو گا کہ جو لوگ حضور خاتم النبیین کے بعد نئی نبوت کا اقرار کرتے ہوں، اُن کی اذانوں، اُن کی نمازوں، اور اُن کے کلمہ پڑھنے کا کوئی اعتبار نہیں، وہ ان سب اُمور کے باوجود پکے کافر اور مرتد ہیں جن پر اسلام کا حکم ہے کہ حد ارتداد جاری کی جائے۔

حارثہ بن مضرب کہتے ہیں کہ میں بنی حنیفہ کی مسجد کے پاس سے گذرا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ مسیلمہ کو نبی مانتے ہیں، میں نے اس کی اطلاع حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو دی، اس پر آپ نے انہیں طلب فرمایا اور توبہ کا حکم دیا۔ (ابوداؤد، جلد ۲ صفحہ ۳۸)

صحیح بخاری میں ہے :-

"قال جریر والاشعث لعبد اللہ بن مسعود فی المرتدین استتبهم وکفلهم فتابوا وکفلهم عشائرهم"
(باب الکفالة فی القرض والدیون)

"جریر اور اشعث نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ وہ (مسیلمہ پر ایمان لانے والے) مرتدین کو توبہ کی طرف بلائیں اور اُن کی کفالت کریں پس وہ تائب ہو گئے اور آپ نے اُن کے کنبوں کی کفالت فرمائی۔"

مگر ان میں مسیلمہ کا پابند صوم وصلوٰۃ مؤذن عبد اللہ بن نواحہ بھی موجود تھا جو مسیلمہ کی طرف سے حضور کی خدمت میں بطور ایلچی حاضر بھی ہو چکا تھا اس نے فقیہ الامت حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی عدالت میں توبہ سے انکار کر دیا،

اس پر آپ نے ارشاد فرمایا :-

"سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لولا انک رسول لضربت عنقک۔ فانت الیوم لست برسول۔"

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا تھا کہ اگر تو ایلچی نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا پس آج تو ایلچی نہیں ہے۔"

(ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۳۸، معجم طبرانی ص ۲۹)

یعنی اس دن تیرے بچنے کی وجہ تیرا ایلچی ہونا تھا، پس آج جبکہ تو ایلچی نہیں ہے تجھ پر اس جرم کی پاداش میں کہ تو خاتم النبیین کے بعد ایک نئے نبی کا اقرار کرتا ہے اللہ کی حد جاری کی جاتی ہے، اس کے بعد آپ نے قرظہ بن کعب انصاری کو حکم دیا اور انہوں نے اسے بر سر عام قتل کر دیا۔

اس حدیث سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ اگر کوئی مسلمان کہلانے والا ختم نبوت جیسے "اسلام کے کسی ایک عقیدۂ قطعیہ" کا بھی انکار کرے تو اس کا

کلمہ گو ہونا، اقرارِ شہادتین کرنا اور پابند صوم وصلوٰۃ ہونا اسے مرتد ہونے سے نہیں بچا سکتا، اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ حضور خاتم النبیین کے بعد کسی نئی نبوت کو پناہ دینے کا انجام اسلامی قانون میں کیا ہے؟

ناظرین کرام! کتاب ناطق اور رسول صادق کے فیصلے تو آپ نے سن لئے اب آئیے اور صحابہ کرام کے تعامل سے بھی سند تصدیق حاصل کیجئے کہ جملہ تعلیمات محمدیہ جو قطع و یقین کے ساتھ آں حضرت سے ثابت ہوں پر مسائل کلامیہ اعتقاد اور مسائل فقہیہ میں تسلیم ہی ایمان شرعی ہے اور کسی ایک یقینی بات کا انکار بھی ایمان سے نکال کر کفر خالص میں داخل کر دیتا ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے نزدیک "کفر" کی حقیقت

(۱) ارتداد منکرین ختم نبوۃ۔
(۲) ارتداد مانعین زکوٰۃ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت کے دو واقعات کو اس سلسلہ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

اوّل الذکر فتنے کا آغاز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حینِ حیات ہی شروع ہو چکا تھا، اور اس فتنے کا بانی مسیلمہ کذاب خود بھی آنحضرتؐ کے دربار میں حاضر ہوا تھا، آپ نے اگرچہ مسیلمہ کذاب پر ایمان رکھنے والوں کو ان کے کلمہ گو ہونے اور نمازیں پڑھنے کے باوجود مرتد، اور واجب القتل قرار دیا تھا۔ مگر آپ کے اس منشا کو عمل میں لانے کی سعادت حضرت صدیق اکبرؓ کے نام لکھی ہوئی تھی، چونکہ اس سلسلے میں اسلام کا موقف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی متعین ہو چکا تھا اس لئے آپ کے بعد تحفظ ختم نبوت کے لئے جہاد کرنے میں جمہور صحابہؓ میں سے کسی نے اختلاف نہ کیا۔ کسی نے نہ کہا کہ یہ لوگ کلمہ گو ہیں، اہلِ قبلہ ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں، ان سے جہاد کیسے کیا جائے، اور انھیں مسلمانوں سے علیحدہ کیسے سمجھا جائے، حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت صدیق اکبرؓ کا اختلاف جو اہلِ علم میں مشہور اور کتب حدیث میں منقول ہے وہ اس بارے میں نہیں تھا، بلکہ مانعین زکوٰۃ کے جہاد میں تھا اور اس میں بھی بعد میں اتفاق ہو گیا تھا۔

القصہ مہاجرینؓ انصار اور صحابہؓ و تابعین کا ایک عظیم الشان لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں یمامہ کی طرف بڑھا، آسمانِ نبوۃ کے ستارے اور ختم نبوت کے پروانے مسیلمہ کذاب اور اس کے چالیس ہزار مسلح جوانوں پر حملہ آور ہوئے، قصرِ ارتداد میں زلزلہ آیا، اور بانی ارتداد مسیلمہ کذاب خود اپنے اٹھائیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں واصلِ جہنم ہوا، مسلمانوں میں سے بارہ سو (۱۲۰۰) کے قریب صحابہؓ و تابعین اس جہاد ختم نبوت میں شہید ہوئے (طبری ج ۳ صفحہ ۲۵۴)

اس سے یہ ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کے نزدیک اگر کوئی شخص تمام اسلامی احکام اور فرائض کو بصدق دل تسلیم کرے اور صرف ایک ایسے حکم کا انکار کرے جو قطع و یقین کے ساتھ اسلام کی تعلیم ہو تو اس کا یہ انکار ایسا ہی کفر وارتداد ہے جیسے تمام شریعت کا انکار اور کل اسلام سے ارتداد۔ ایمان بالبعض اور کفر بالبعض اس کو کفر کی زد سے نہیں بچا سکتا۔

عہد صدیقی کا یہ واقعہ اگرچہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیش آیا۔ مگر اس لئے کہ اس کا سنگِ بنیاد آنحضرت کے حینِ حیات ہی رکھ دیا گیا اس کو عہد نبوت کے واقعات میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے در اصل یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی سرحدیں ایک طرف حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے اور دوسری طرف خلیفۃ المومنین افضل الصحابہ بالتحقیق حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ متصل ہوتی ہیں لہذا اب آپ کے سامنے ایک دوسرا واقعہ پیش کیا جاتا ہے، جسے کہ خالصۃً عہد صدیقی کا تعامل کہنا چاہیے اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نے آپ کے بعد بھی نئے نئے اٹھنے والے فتنوں میں اسی اصول کو مشعلِ راہ بنایا ہے کہ بعض اسلام کے انکار اور کل اسلام کے انکار میں کوئی فرق نہیں اور دونوں کا حکم شریعت اسلامیہ میں ارتداد کہلاتا ہے

ارتداد مانعین زکوٰۃ

حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد خلافت میں کچھ لوگ مسئلہ زکوٰۃ میں اسلام سے یوں دست بردار ہوئے تھے:-

"نقیم الصلوٰۃ ولا نؤدی الزکوٰۃ" (فتوح البلدان صفحہ ۱۰۱)

"ہم نماز کو تو قائم کریں گے لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے۔"

اِس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے باوجودیکہ یہ اہلِ قبلہ تھے، کلمہ گو تھے، مُسلمان کہلاتے تھے اور نمازیں پڑھتے تھے، صرف اِس لئے اُن سے جہاد کیا کہ وہ اسلام کی ایک ایسی بات سے دستبردار ہو گئے تھے، جس کا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہونا قطع و یقین سے ثابت ہو چکا تھا۔ پس بعض اسلام کے انکار کو کل اسلام کے انکار کے مترادف قرار دیکر صدیق اکبرؓ نے اسلام کو پارہ پارہ ہونے سے بچا لیا۔ فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جن کے "اعلم بالکتاب والسنۃ" ہونے پر کتب حدیث و فقہ کے ہزاروں صفحات شہادت دے رہے ہیں، خود فرماتے ہیں:۔

"لقد قمنا بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاماً کدنا نھلک فیہ لولا ان اللہ منّ علینا بابی بکرٍ اجمع [illegible] اجمیعاً علی ان لا نقاتل [illegible] لابی بکرؓ قتالھم" (فتوح بلاذری صلا)

"ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یقیناً ایک ایسے مقام پر کھڑے ہو گئے تھے کہ قریب تھا کہ ہم ہلاک ہو جائیں اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیق اکبرؓ کے وجود کا ہم پر احسان نہ کیا ہوتا ہم سب کی رائے یہ تھی کہ منکرینِ زکوٰۃ سے جہاد نہ کریں لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو ثابت قدم رکھا۔"

یہ وہ دن تھا کہ کفر و ایمان کی امتیازی حدود خطرے میں تھیں، فراقِ پیغمبرؐ کے غم، وقت کی نزاکت اور مسلمانوں کے ضعف کے علاوہ ان لوگوں کا کلمہ پڑھنا، نمازیں پڑھنا اور باقی جملہ قواطعاتِ اسلام پر ایمان رکھنا موجبِ تذبذب تھا کہ ان سے جہاد کیا جائے یا نہ لیکن حضرت صدیق اکبرؓ نے نہ مسلمانوں کی بے سر و سامانی کا خیال کیا، اور نہ ان مانعینِ زکوٰۃ کی نمازیں، اُن کے اقرارِ شہادتین اور ان کے اہلِ قبلہ ہونے کے دعاوی حضرت صدیق اکبرؓ کے پائے استقلال میں کسی قسم کی لغزش پیدا کر سکے۔ آپ نے شرائعِ اسلام کی قطعیت کو سیاسی مصلحتوں پر قربان کرنے کی بجائے جہاد کا اعلان فرمایا۔ اور "ایک قطعی اسلامی اصول" کے انکار کو کل اسلام کا انکار قرار دیکر اُن سے جہاد کیا، سارے کے سارے صحابہ بھی آپ کے ساتھ ہو گئے اور اس اسلامی اصل کو درجہ اجماع حاصل ہو گیا۔

علامہ ابوالفتح محمد بن عبدالکریم شہرستانی (متوفی ۵۴۸ھ) لکھتے ہیں:

"قال قوم لانقاتلھم قتال الکفرۃ وقال قوم بل نقاتلھم حتی قال ابوبکرؓ لو منعونی عقالاً مما اعطوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علیہ ومضی بنفسہ الی قتالھم ووافقہ الصحابۃ باسرھم" (الملل والنحل ج۱ صلا)

"کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم مانعین زکوٰۃ سے جہادِ کفار[1] نہیں کرینگے اور کچھ لوگوں نے کہا کہ نہیں ہم ضرور اُن سے جہاد کرینگے، حتی کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اگر وہ لوگ اونٹ کی رسّی بھی جو وہ عہدِ رسالتؐ میں زکوٰۃ میں دیا کرتے تھے نہ دینگے تو میں اکیلا اُن سے جہاد کروں گا۔ آپ خود اس جہاد کے لئے نکلے اور سارے صحابہ آپ کے ساتھ ہو گئے۔"

عن ابی ھریرۃؓ قال لما توفی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واستخلف ابوبکرؓ وکفر من کفر من العرب قال عمرؓ یا ابابکرؓ کیف تقاتل الناس وقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم "اُمِرْتُ اَنْ اُقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ فمن قال لا الٰہ الا اللہ عصم منی مالہٗ ونفسہ الا بحقہ وحسابہ علی اللہ قال ابوبکرؓ واللہ لاقاتلن من فرّق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ فان الزکوٰۃ حق المال واللہ لو منعونی عناقاً[3] کانوا

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنا لئے گئے اور عربوں میں کچھ لوگ کافر ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ اے ابوبکرؓ آپ ان لوگوں سے جہاد کرنے کیسے مجاز ہیں حالانکہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اُس وقت تک لوگوں سے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ وہ کلمۂ توحید نہ پڑھ لیں پس جس نے اس کا اقرار کر لیا اُس نے سوائے "اسلامی حدود[2]" کے اپنے جان و مال کو محفوظ کر لیا۔ باقی اس کا حساب اللہ کے سپرد ہے حضرت ابوبکرؓ نے کہا خدا کی قسم میں ضرور ان لوگوں سے جہاد کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرتے ہیں کیونکہ زکوٰۃ حق المال ہے (جس طرح نماز حق البدن ہے)،

---

[1] یہاں اس امر کی تصریح ہو کہ جہاد کرنے والوں نے اسے جہادِ بغاۃ نہیں بلکہ جہادِ کفار ہی سمجھا ہوا تھا۔ [2] جیسے قتلِ عمد، زنا، اور ارتداد کے سلسلہ میں اسلامی قانون کے ماتحت اس شخص کی جان بھی محفوظ نہیں جو اس فعل سے پہلے مسلمان ہو۔ ۱۲

[3] عناقاً اور عقالاً کے اختلاف کے لئے دیکھئے فتح الملھم ج ۱ صفحہ ۱۹۳۔

يؤدونها الى رسول الله صلى الله عليه وسلم لقاتلتهم على منعها قال عمرؓ فوالله ما هو الا ان رأيت ان قد شرح الله صدر ابی بکر للقتال فعرفت انه الحق۔

بخدا اگر یہ لوگ بکری کا ایک بچہ بھی جو وہ بسلسلۂ زکوٰۃ حضور کو ادا کرتے تھے نہ دیں گے تو میں اس پر بھی ان سے جہاد کروں گا۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ مجھے اُس وقت سمجھ آئی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر کا شرح صدر فرما دیا ہے، اور میں نے جان لیا کہ وہ حق پر تھے۔"

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۲۳)

خلاصہ جواب حضرت صدیق اکبرؓ

"حضورؐ نے جو کلمہ گو کے جان و مال کے محفوظ ہونے کا اعلان کیا تو اس میں "الا بحقہ" کے ساتھ حق اسلام کو مستثنیٰ کیا یعنی حق اسلام کے لئے کلمہ گو کے ساتھ بھی جہاد ہو سکتا ہے۔ مسلمان کے بدن اور مال دونوں پر اسلام کا حق ہے، نماز 'حق البدن' ہے اور زکوٰۃ 'حق المال' تو جس نے ان دونوں میں تفریق کردی میں اس کے ساتھ حق اسلام کے لئے جہاد کروں گا۔"

جامعیتِ استدلال حضرت صدیق اکبرؓ

حضرت ابوبکرؓ نے جو استدلال فرمایا وہ خواہ مانعین زکوٰۃ باغی ٹھیرائے جائیں یا مرتدین بہر دو صورت جہاد و قتال کے لئے جواز کی کامل دلیل ہے۔ لیکن اگر ذرا اور دقت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت صدیق اکبرؓ "فان الزکوٰۃ حق المال" کہکر اس طرف بھی اشارہ فرما گئے کہ وہ لوگ زکوٰۃ کے حق المال ہونے سے ہی منکر تھے، اور اس طرح اسلام کے ایک قطعی رکن زکوٰۃ کی فرضیت کے انکار سے کل اسلام سے ہی مرتد ہو چکے تھے کیوں کہ اگر وہ لوگ زکوٰۃ کو فرض تو سمجھتے اور صرف ادائیگی سے بغاوت کرتے تو حضرت صدیق اکبر کا استدلال "فان الزکوٰۃ حق بیت المال" ہوتا، "فان الزکوٰۃ حق المال" نہ ہوتا۔ فاحفظہ لعلک لا تجدھا عند غیرنا۔

علاوہ ازیں آپ کا "من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ" کے ساتھ مانعین زکوٰۃ پر تفریق نماز و زکوٰۃ کا الزام لگانا خود ان کے جرم کی نشاندہی کرتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں بیسیوں موقعوں پر "اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ" کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کو جمع فرمایا وہ لوگ اس جمع سے ہی منکر ہو کر تفریق کے مجرم ہو چکے تھے، اب یہ تو ظاہر ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کی جمع 'عمل' کے لحاظ سے تو ممکن نہیں کیوں کہ شرائط اور اوقات دونوں کے بالکل متفرق اور متباین ہیں اس لئے اگر کوئی جمع ان دونوں میں ممکن ہو سکتی ہے تو وہ صرف "جمع اعتقاد" ہی ہے، پس جبکہ ان دونوں کی جمع ہی جمع اعتقاد ہے تو جو شخص ان میں تفریق کرے گا وہ 'تفریق' بھی 'تفریق عمل' نہیں ہوگی، "تفریق اعتقاد" ہی ہوگی۔ بناءً علیہ ثابت ہوا کہ "من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ" کے ملزم زکوٰۃ کی فرضیت کے انکار سے کل اسلام سے ہی مرتد ہو چکے تھے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے علمی کمال، دقت نظر، نکتہ سنجی، جامعیت شان، اور تبحر و تفقہ سے دنیا کے مسلّم نکتہ رس اور معقّن دماغ حضرت فاروق اعظمؓ یہاں تک متاثر ہوئے کہ فرماتے ہیں:-

"مجھے اس وقت سمجھ آئی کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابوبکرؓ کا شرح صدر فرما دیا ہوا ہے اور میں نے جان لیا کہ وہ حق پر تھے۔"

(صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۲۳)

حضرت صدیق اکبرؓ کے اس استدلال سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے:-

(۱) حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نزدیک صرف اقرار کلمہ، مسلمان ہونے اور کہلانے کے لئے کافی نہ تھا بلکہ ایمان اس حقیقت کا نام تھا کہ جملہ تعلیمات محمدیہ پر جو قطع و یقین کے ساتھ شارع علیہ السلام سے ثابت ہوں اعتقاد رکھا جائے اور سر تسلیم خم کیا جائے۔

(۲) اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص یا کوئی جماعت تمام اسلامی فرائض اور احکام کو بصدق دل تسلیم کرے لیکن ضروریات دین اور "مؤمن بہا امور" (یعنی وہ امور جن پر اعتقاد رکھنا جزو ایمان ہو) میں سے کسی ایک کا بھی انکار کردے تو اس کے اقرار "لا الٰہ الا اللہ" کا بھی کوئی اعتبار نہیں رہتا۔ "من انکر شیئاً من شرائع الاسلام فقد ابطل قول لا الٰہ الا اللہ" (سیر کبیر جلد ۴ ص ۲۶۵)

(۳) اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ایمان زیادتی اور کمی کو قبول نہیں کرتا

یعنی جتنے اُمور پر حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ایمان لانا ضروری تھا آج بھی اُتنے اُمور پر ہی ایمان لانا مومن ہونے کے لئے ضروری ہے" "مؤمن بھا امور" میں سے کسی ایک کا انکار بھی اسلام سے نکال کر کفر خالص میں داخل کر دیتا ہے' انسان یا تو پُورا مومن ہوگا اور یا پُورا کافر۔ یہ نہیں کہ کبھی ایمان تھوڑا ہو جائے اور کبھی زیادہ ہاں قوت اور ضعف کے اعتبار سے ایمان میں تفاوت ہو سکتا ہے مگر یہ زیادتی اور کمی 'کیفیت ایمان' میں ہے نہ کہ 'کمیت ایمان' میں۔ مقدار ایمان میں خواہ کمی ہو خواہ زیادتی ہر دو کفر کی شاہراہیں ہیں۔ فافھم ولا تکن من القاصرین۔

۴۔ علامہ خطابیؒ لکھتے ہیں کہ "حضرت صدیق اکبرؓ نے زکوٰۃ کو (حق المال کہہ کر) نماز پر (جو حق البدن ہے) قیاس کیا اور اس قیاس سے استدلال مکمل فرمایا" اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ قیاس کو جو شرعی قواعد کے مطابق ہو نہ صرف جائز بلکہ اسلامی مسائل کے لئے ایک اُصول سمجھتے تھے۔

۵۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے استدلال سے یہ بھی ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کا اس پر اتفاق تھا کہ تارکین نماز اگر اپنے اس موقف پر اصرار کریں تو اسلامی حکومت پر ان سے جہاد کرنا فرض ہے (دلیل لا و طارح ۴) کیوں کہ قیاس اور اجتہاد کے وقت 'مختلف فیہ' کو 'متفق علیہ' کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے حق المال کو حق البدن پر قیاس کیا۔

۶۔ صدیق اکبرؓ کے اس استدلال سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نص صریح کی موجودگی میں بھی اس کی تائید میں حسب قواعد شرعیہ قیاس اور اجتہاد کیا جا سکتا ہے کیوں کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس آنحضرت کی یہ نص صریح بھی پہنچ چکی تھی کہ منع زکوٰۃ پر باوجود اقرار شہادتین اسلام نے جہاد کا حکم دیا ہے۔

عن انس بن مالکؓ قال لما توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارتدت العرب فقال عمر یا ابا بکر کیف تقاتل العرب فقال ابو بکر انما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ ۔۔۔۔ الحدیث

"حضرت انسؓ بن مالکؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو کچھ عرب[له] مرتد ہو گئے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اے ابو بکرؓ آپ ان لوگوں سے جہاد کرنے کے کیسے مجاز ہیں تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مجھے حکم دیا گیا کہ جب تک لوگ اقرار توحید و رسالت نہ کریں اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ نہ کریں اُس وقت تک ان سے جہاد کرتا رہوں۔"

(سنن نسائی ج ۲ ص ۱۴۳)

۷۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے اس استدلال اور حکم ارتداد سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ "اقرار شہادتین کے بعد کوئی شخص اسلام سے اُس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک کہ خود اُس نے اسلام چھوڑنے کا ارادہ نہ کیا ہو" وہ سخت اصولی غلطی میں ہیں کیونکہ مانعین زکوٰۃ نے خود ترک اسلام کا ارادہ نہیں کیا تھا مگر با ایں ہمہ ترک اسلام کر چکے تھے۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:-

"کما ان الردۃ تتجرد عن السب فکذالک قد تتجرد عن قصد تبدیل الدین وارادۃ التکذیب بالرسالۃ کما تجرد کفر ابلیس عن قصد التکذیب بالربوبیۃ وان کان عدم ھذا القصد لا ینفعہ"

"جیسا کہ بعض اوقات ارتداد 'سب' سے مجرد ہوتا ہے اسی طرح بعض اوقات تبدیل دین اور تکذیب رسالت کے ارادے سے بھی مجرد ہوتا ہے، جیسا کہ ابلیس کا کفر اس قصد سے پاک اور مجرد تھا کہ حضرت ربوبیت کی تکذیب کی جائے اگرچہ اس ارادے کا نہ ہونا اُسے کفر سے نہ بچا سکتا ہو۔"

(الصارم المسلول صفحہ ۳۶۷)

۸۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے اس استدلال سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اجماع کا اعتبار صرف ان ہی معاملات میں ہوتا ہے جن میں کتاب و سنت کی واضح ہدایات یا النصوص صریحہ پر مبنی 'جلی اجتہاد' موجود نہ ہو،

له اس مقام پر حضرت انس بن مالک تصریح کرتے ہیں کہ مانعین زکوٰۃ مرتد تھے نہ کہ بغاۃ۔ پس وہ اصل زکوٰۃ سے ہی منکر سمجھے جائیں گے نہ کہ ادا سے۔ ۱۲

تذکرہ بزرگانِ دیوبند:- دوسری قسط:-

حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی رح

(از مولانا نسیم احمد فریدی فاروقی استاذ مدرسہ عربیہ امروہہ)

مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ کا قیام اور تشکیل

جیسا کہ لکھا جا چکا کہ ماہ رمضان ۱۳۰۳ھ میں حضرت محدث امروہی رح مدرسہ شاہی مراد آباد سے مستعفی ہو چکے تھے۔ اب وہ اپنے وطن عزیز میں تشریف لے آئے اور یہاں پر مدرسہ اسلامیہ عربیہ کی تشکیل جدید کی۔ یہ مدرسہ بنیادی حیثیت سے حضرت قاسم العلوم رح کا قائم کردہ ہے انھیں کے ایماء پر اس مدرسہ کی داغ بیل پڑی تھی۔ شمالی ہند کے جہاں اور بہت سے مدارس اسلامیہ حضرت قاسم العلوم رح کی یادگار ہیں وہاں یہ مدرسہ بھی انہیں کی یادگار اور اُن کے دریائے فیض کی ایک نہر ہے۔ حضرت نانوتوی رح کی حیات میں اور اُن کی وفات کے کچھ سال بعد تک یہ مدرسہ متعدد محلوں میں، مختلف ناموں سے ابتدائی و متوسط حالت میں چل رہا تھا۔ حضرت امروہی رح نے مراد آباد سے آکر جامع مسجد امروہہ میں اس کو باقاعدہ اور باضابطہ طریقہ پر قائم کیا۔ از سر نو اس کی بنیادوں کو مضبوط کر کے اُس میں تمام علوم و فنون کی تعلیم جاری کی۔ پہلے ہی سال اس مدرسہ کی شہرت حضرت محدث امروہی کی شخصیت کی بناء پر دُور و نزدیک ہو گئی۔ کچھ طلباء ذی استعداد تو مراد آباد سے آپ کے ہمراہ آئے تھے۔ اُس کے بعد مستقبل قریب ہی میں تشنگانِ علوم نبویہ شدِّ رحال کر کے دُور دُور سے سرزمین امروہہ کے اس چشمۂ فیض پر وارد ہو گئے۔ مدرسہ کی معنوی تشکیل جدید کے ساتھ ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اُس کی ضروری عمارتوں کی طرف بھی توجہ مبذول فرمائی اپنی اور اپنے رفقاء کی کوششوں سے جامع مسجد امروہہ کی تعمیر میں اضافہ کیا اور اُس کو پر رونق و شاندار کر دیا۔ جامع مسجد کے جنوبی و شمالی گوشوں میں پانباڑی تالاب کے کنارے خوبصورت اور ہوادار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ اُس کے مشرق میں دارالحدیث بنوائی، دارالحدیث کے آس پاس کئی درسگاہیں تھیں، مدرسین و طلباء کے قیام کے لئے کچھ حجرے بالائی حصّے میں تعمیر کرائے۔ غرضیکہ مدرسہ کو گلزار کر دیا۔

مولٰنا ظہور علی صاحب بچھرایونی مرحوم جو کہ اس مدرسہ کے فرزندانِ قدیم میں سے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ جب ہم لوگ حضرت مولٰنا کے ہمراہ مراد آباد سے امروہہ آئے ہیں تو جس جگہ دارالحدیث ہے وہاں اُفتادہ زمین تھی اُس زمین میں ہم ترکاری بو دیا کرتے تھے۔ حضرت مولٰنا امروہی رح نے مدرسہ کی ظاہری و باطنی تعمیر میں اپنی تمام تدابیر اور صلاحیتیں صرف فرمائیں۔ کئی سال تک تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مدرسہ کی مالی حالت مضبوط کرنے کے لئے مسلسل جدّ و جہد فرمائی۔

آپ کی علمی وجاہت، رُوحانی تاثیر اور اخلاص و للّٰہیت کی برکت تھی کہ مختلف طبقات کے ذی اثر اشخاص آپ کی اس علمی و تبلیغی تحریک میں دل و جان سے شریک ہو گئے تھے۔

شاہ بہاؤ الدین صاحب نقشبندی رح نواب وقار الملک مرحوم منصف امتیاز علی مرحوم، محلہ ملانہ کے بااثر حضرات اور ہر ہر محلے اور برادری کے ممتاز و دیندار غریب و امیر اشخاص نے اس کارِ خیر میں خوب خوب حصّہ لیا۔ اور مدرسہ کی ترقی و استحکام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

حضرت مولانا نانوتوی رح نے دارالعلوم دیوبند کو جس طرح عمومی چندہ

کے اصول پر قائم فرمایا تھا اور جن جن طریقوں پر اُن کے قائم کردہ مدارس چل رہے تھے بعینہٖ اسی طرز پر حضرت مولٰنا امروہی ؒ نے اس مدرسہ امروہہ کو چلایا۔ احقر نے وہ رسیدیں دیکھی ہیں جن پر خود حضرت والا کے دستخط وصولیابی کے خانے میں ثبت ہیں اور جن کو خود شہر میں اپنے رفقاء کے ساتھ چل پھر کر پُر کیا ہے۔

ابتداء میں خود ہی حضرت مولٰنا صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہیں خود ہی مہتمم و منتظم ہیں خود ہی چندہ وصول کر رہے ہیں اور خود ہی کتب خانہ کی فراہمی، مدرسین کے تقرر، اور طلباء کے داخلہ کا انتظام فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اُن کے دل میں اشاعتِ دین کی جو تڑپ رکھی تھی اُسی تڑپ کا یہ نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے اپنے اُستاذِ معظم حضرت نانوتوی ؒ کی تحریکِ تعلیم دین و تبلیغ احکام شرعِ متین کو چلانے کے لئے اتنی انتھک کوششیں کیں جن کا آج پُورا پُورا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

امروہہ ایک قدیم تاریخی بستی ہے اس میں بڑے بڑے مشائخ، علماء اور ہر ہر فن کے ماہرین پیدا ہوئے، یہاں پر ہر زمانہ میں نامور ہستیاں پیدا ہوئیں۔ یہاں معز الدین کیقباد کے عہد میں سب سے پہلا عربی مدرسہ معزیہ کے نام سے قائم ہوا تھا، جو مدتوں قائم رہا۔ یہاں کی خانقاہوں میں علم و عرفان کی بارشیں ہوتی تھیں۔ اکبری دور کے مشہور میر عدل مولٰنا سید محمد رحمۃ اللہ علیہ اِسی سرزمین کے باشندے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی رحمۃ اللہ علیہ، صاحب منتخب التواریخ، انہیں مولٰنا سید محمد میر عدل ؒ سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے امروہہ آئے تھے۔ ہندوستان کے آخری دور کے مشہور محدث حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی رح نے اِسی سرزمین کے ایک اہلِ دل محدث و قاری حضرت مولٰنا قاری امام الدین بخشی ؒ (خلیفہ حضرت شاہ غلام علی دہلوی ؒ) سے تجوید کی سند حاصل کی تھی اور بخاری شریف کے اٹھارہ پارے پڑھے تھے بعدہٗ وہ حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلوی ؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے تھے۔ (ملاحظہ ہو تذکرۂ رحمانیہ)

اسی مردم خیز سرزمین پر جس کی تاریخی حیثیت کی تفصیل کا موقعہ نہیں، ۱۸۵۷ء سے پہلے مسجدوں، گھر کی بیٹھکوں اور محلہ کی سہ دریوں میں بہت سے انفرادی مکاتب موجود تھے جن میں بہترین بہترین ماہرین فن ہر علم و فن کی تعلیم دیا کرتے تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد اس علمی شہر کی درسی محفلیں خاموش ہوگئی تھیں، حدیث و تفسیر اور فقہ کے وہ چرچے نہیں رہے تھے، معقولات اور جملہ فنون کی تحصیل کا کسی کسی کے اندر ذوق باقی تھا۔ غرض کہ عربی تعلیم خصوصاً علم دین کا خاتمہ نظر آتا تھا۔

یہ حضرت قاسم العلوم والمعارف اور اُن کے ممتاز شاگرد کا صدقہ ہے کہ امروہہ کی روایات قدیمہ دوبارہ زندہ ہوگئیں اور ہند و بیرونِ ہند میں اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

مدرسہ کے اساتذہ

علاوہ حضرت محدث امروہی ؒ کے جو مدرسہ کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے اور جن کی علمی شہرت کی وجہ سے مدرسہ بامِ عروج پر گامزن ہوا تھا، دیگر باکمال اور متبحر اساتذہ اس مدرسہ میں وقتاً فوقتاً درس دیتے رہے۔ چند کے اسماء پیش کرتا ہوں:۔

(۱) مفسرِ جلیل حضرت مولٰنا حافظ عبدالرحمٰن صاحب صدیقی ؒ جو بعد میں آپ کے جانشین ہوئے۔

(۲) حضرت مولٰنا حافظ شاہ عبدالغنی صاحب پھلاودی ؒ جو علوم ظاہریہ و باطنیہ کے جامع تھے اور ہر علم و فن میں خصوصاً علم ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے تقریباً ۱۵ پندرہ مقامے مقامات حریری کے اُن کو ازبر تھے جیسا کہ سُننے میں آیا ہے۔

(۳) حضرت مولٰنا نور الزماں صاحب پنجابی۔ یہ صرف و نحو کے بہترین ماہر تھے بعد میں اِن پر درویشی کا غلبہ ہوگیا تھا۔ کالا باغ کے علاقے کے مشہور صاحب سلسلہ بزرگ گذرے ہیں۔

(۴) حضرت مولٰنا سید رضا حسن صاحب ؒ برادر زادہ و دامادِ حضرت امروہی ؒ۔ تمام علوم خصوصاً صرف و نحو میں خاص قابلیت رکھتے تھے۔

(۵) حضرت مولٰنا محمد امین الدین خاں شاہ آبادی ثم امروہی رح معقولات میں خاص طور پر اپنے اُستاذ حضرت امروہی رح کا نمونہ تھے۔ بعد میں طبیہ کالج دہلی میں پروفیسر مقرر ہوئے اور

آخر میں وائس پرنسپل ہو گئے تھے۔

(۶) حضرت مولانا خادم حسین صاحب امروہیؒ۔ عربی و فارسی کے بہترین ادیب تھے۔ بعد میں مدرسہ عباسیہ بہاولپور کے صدر مدرس ہو گئے تھے۔

فارسی درجات میں مولانا ظفریاب خاں صاحب بجنوری مرحوم انتہائی فارسی ادبیات پڑھاتے تھے کثیر التعداد طلباء نے فارسی لٹریچر میں آپ کے فیضِ درس سے کمال حاصل کیا۔

شہر کے مشہور ریاضی داں منشی چاند خاں صاحب مرحوم، ریاضی پڑھاتے تھے۔

استاذ القراء قاری ضیاء الدین صاحب الٰہ آبادیؒ:

مدرسہ کے قیام کے کچھ سال بعد مُلک کے مشہور قاری و مجوّد حضرت مولانا قاری ضیاء الدین صاحب الٰہ آبادیؒ۔ علم تجوید کی تکمیل کے بعد امروہہ تشریف لے آئے یہاں وہ حضرت محدث امروہیؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور علم حدیث و تفسیر حاصل کیا۔ مولانا قاری سید محمد صاحب مدظلہ، صاحبزادہ حضرت محدث امروہی رح کو انہوں نے تجوید کے ساتھ قرآن شریف حفظ کرایا۔ اور دیگر طلباء کو بھی فیض پہونچایا۔ میں نے بعض وہ خطوط پھلاودہ میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے نام دیکھے ہیں جن میں حضرت محدث امروہیؒ نے قاری ضیاء الدین صاحبؒ کے تقرر کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے۔ قاری صاحب مرحوم و مغفور کے ذریعے یہاں پر علم تجوید کا بڑا چرچا ہوا، اور بہت سے شہری و بیرونی طلاب نے اُن سے اپنا قرآن دُرست کر لیا۔

طب کی تعلیم:

حضرت مولانا امروہیؒ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ علم الادیان کے ساتھ ساتھ علم الابدان کے اسباق بھی پڑھاتے تھے بہت سے لوں نے آپ سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے طب کا پورا نصاب کُتب خانہ میں جمع کر لیا تھا اور ایک ایک کتاب کے کئی کئی نسخے تعلیم کی غرض سے مہیا کئے تھے۔ اس درس میں خاص طور پر وہ طلباء شریک ہوتے تھے جو اپنی پوری زندگی کسی مدرسہ میں گم اور دینے

کی ہمت نہ رکھتے تھے یا جن کے والدین نے غالباً یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ اُن کے بچے "تعلیمی تحریک" کا رکن بن کر قلیل تنخواہوں پر اکتفا کریں

علاوہ ازیں امروہہ اُس زمانے میں طبی حیثیت سے عروج پر تھا۔ حکیم سید احمد سعید صاحب افسر الاطباء دکن، حکیم سید علی حسن صاحب حکیم سید ابن حسن صاحب، حکیم عبد السلام صاحب، حکیم عبد القیوم صاحب، حکیم حکمت اللہ صاحب اور امروہہ کے دیگر حاذق اطباء امروہہ و بیرون امروہہ میں پوری پوری شہرت رکھتے تھے اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں طب کی اہمیت عام ذہنوں پر طاری تھی۔ حضرت مولانا رح کی حکمت مآب طبیعت نے ایسے موقع پر مناسب جانا کہ ذہنوں کی طب پسندی سے کام لیکر اُن کو حدیث و تفسیر و فقہ سے بھی آشنا کر دیا جائے۔ چنانچہ شہر کے ذہین و ذی استعداد طلباء کی بڑی تعداد ایسی پیدا ہوئی جنہوں نے تمام درسیات ختم کرنے کے ساتھ ساتھ طب میں بھی کمال حاصل کیا۔ اُن میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:۔

اُستاذ الاطباء مولانا حکیم فرید احمد صاحب عباسی امروہی مدظلہٗ

مولانا حکیم مختار احمد صاحب صدیقی امروہی مدظلہٗ نزیل بریلی

مولانا حکیم اسرار الحق صاحب صدیقی امروہی مرحوم۔

مولانا حکیم سید محمود الحسن صاحب امروہی مرحوم برادر زادہ حضرت مولانا امروہیؒ

مولانا حکیم ظہور الحق صاحب صدیقی امروہی مرحوم

حکیم سید حامد حسن صاحب امروہی مرحوم افسر الاطباء حیدرآباد دکن (برادر علاتی حضرت مولانا امروہیؒ)

مدرسہ کے حق میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی دُعاء

مدرسہ کے قیام کے دو سال بعد شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ اپنے مرید مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھلاودی رح کو ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت سراپا برکت عزیزم مولوی عبدالغنی صاحب مدرس مدرسہ امروہہ رزقہ اللہ تعالیٰ

محبت و معرفت۔ بعد سلام مسنون دعائے خیر و برکت کے واضح رائے سعادت انتمائے ہو کر آپ کا نامہ مرقومہ ۳۰ شعبان ۱۳۰۵ھ ہجری قدسی وارد ہوا ——
— اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ اپنے فضل و کرم سے آپ کے مدرسہ کی مدد و اعانت کرتا رہے گا۔ اور سب سرمایوں سے باقی اور لازوال سرمایہ توکل ہے جس چیز کا یا جس کا اللہ جل جلالہٗ خود وکیل ہوا تو اس کا کیا کہنا ہے آپ لوگ نظر حضرت حق کی رحمت پر رکھکر اس کے بندوں کو باخلاص تعلیم و تلقین فرمائیے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں آپ بھی دعا فرمائیے اللہ تعالیٰ آپ کو مستطیع فرماکر شرف زیارت سے حرمین شریفین کے مشرف فرماوے“ ——

السلام علیکم و علیٰ من لدیکم

۲۱ ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ ہجری قدسی

(دیکھو ذخیرہ مکتوبات اکابر در کتب خانہ پھلاودہ)

حضرت حاجی صاحبؒ کا پیغام مولانا امروہیؒ کے نام

حاجی محبوب خانصاحب امروہی مرحوم نے مجھسے ایک سے زائد مرتبہ یہ واقعہ بیان کیا کہ جب میں حج بیت اللہ کے لئے جانے لگا تو حضرت مولانا امروہیؒ نے فرمایا کہ ”حضرت حاجی صاحبؒ سے میرا سلام عرض کرنا اور یہ کہدینا کہ دل حاضری کو بہت چاہتا ہے لیکن کارہائے مدرسہ فرصت نہیں دیتے“۔ حاجی محبوب خاں صاحب نے مکہ معظمہ پہونچکر حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں اُن کے ایک مخلص مرید و خلیفہ کا یہ سلام و کلام پیش کردیا۔ اُس کے جواب میں حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ ”ہماری یہ ٹوپی اُن کو دیدینا اور یہ کہنا کہ جو کام تم امروہہ میں رہ کر انجام دے رہے ہو وہ یہاں کی حاضری سے بہتر ہے“

(باقی باقی)

قسط ۲۵:-

احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن

(حضرت مولٰنا مناظر احسن گیلانی)

پہلا سفر اس سلسلہ میں "گروکل کانگڑی" کا ہے، جو جانتے ہیں وہ تو خیر جانتے ہی ہیں، لیکن جو نہیں جانتے ہیں اُن کے لئے اتنا اجمالی بیان غالباً کافی ہوگا کہ پنڈت دیانند سرسوتی اور ان کے ماننے والوں نے "آریہ سماج" کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی، اِس جماعت نے ہردوار کے قریب کانگڑی نامی جنگلی گاؤں کے قریب ایک خاص قسم کی تعلیم گاہ بھی قائم کی جو اس وقت تک موجود ہے، اس تعلیم گاہ کے متعلق کبھی کبھی اخباروں میں مقالات و مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔ بنیادی طور پر تو یہ ایک مذہبی مدرسہ ہی لیکن ان ہی مضامین و مقالات سے معلوم ہوتا تھا کہ ہندو مذہب کے قدیم علوم و فنون اور سنسکرت و بھاشا کے ساتھ ساتھ جدید علوم اور سائنس وغیرہ کے سیکھنے سکھانے کا نظم بھی یہاں کیا گیا ہے، دل میں ہوس تو زمانہ سے تھی کہ اس نئی مذہبی تعلیم گاہ کو آنکھوں سے دیکھتا، جس ماحول میں میری تعلیمی زندگی گذری تھی، اس کے لحاظ سے یہ خیال تھا تو عجیب و غریب ٹھیٹ پرانے عربی مدارس کے سوا جس نے آجتک ایک دن کے لئے بھی کسی جدید تعلیم گاہ میں قدم نہ رکھا تھا۔ اس کے دل میں کانگڑی کے اس "گروکل" کے دیکھنے کا شوق کیوں اور کیسے پیدا ہوا۔ لیکن بہرحال شوق پیدا ہوا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔ اسی عرصہ میں متعدد بار دہرہ دون جاتے ہوئے ہردوار کے اسٹیشن سے بھی گذرنا پڑا معلوم ہوا کہ گروکل کانگڑی جانے کے لئے ہردوار ہی میں اُترنا پڑتا ہے۔ آخر ایک دفعہ جب کسی ضرورت سے فقیر رڑکی پہونچا۔ یہ طے کرلیا کہ کچھ بھی ہو۔ گروکل تک مجھے پہونچنا چاہئے۔ رڑکی میں بعض لوگوں سے اس خیال کو میں نے ظاہر کیا، اُن میں سے کچھ سن رسیدہ لوگوں نے کہا کہ اولاً تنہا جانا قرین مصلحت نہیں، ثانیاً یہ برسات کا موسم ہے۔

جہانتک ہم جانتے ہیں ہردوار سے کانگڑی تک جانے میں بہت سے چھوٹے بڑے نالوں سے گذرنا پڑے گا، لیکن وہ وقت ہی اور تھا۔ اپنی ان شبابی اُمنگوں کو سوچتا ہوں تو سر بہ گریباں ہوجاتا ہوں۔ کیا میں ہی وہ تھا جس کے لئے سفر اور سفر کی دشواریاں سب سے زیادہ دلچسپ اور خوشگوار شغلوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اپنے مخلص مشیروں کی بات نہ مانی، رڑکی کے ایک بوڑھے بزرگ نے کان میں آکر کہا کہ کم از کم اپنی مولویت کو اس سفر میں چاہئے کہ نمایاں ہونے نہ دینا۔ میں نے عرض کیا کہ پھر کیا کروں؟ بولے کہ ابھی تو نہیں، لیکن جب گروکل کے قریب پہونچ جاؤ تو عامی مسلمانوں کی طرح لنگی یا دھوتی باندھ لینا، اور کھانا میں اپنے ساتھ صرف اسی قدر رکھنا جو میں تمہارے ساتھ کروں گا۔ گاڑی ہردوار جانے والی تھی۔ اسی پر سوار ہونے کے لئے اسٹیشن آیا، تو دیکھا کہ وہی بزرگ اپنے ساتھ کپڑے میں باندھے ہوئے کچھ چیز لائے ہیں۔ یہ چند موٹی موٹی روٹیاں اور آلو کے بھرتے سے بھرا ہوا ایک پیالہ تھا، میرے حوالے اسی کو انہوں نے کردیا، تام چینی کا ایک جگ یا تام لوٹ بھی یہ دیکھ کر ساتھ کر دیا تھا کہ لوٹا میرے ساتھ کسی وجہ سے اس سفر میں نہ تھا، سامان میں بستر کے سوا طبقات ابن سعد کی ایک جلد تھی۔ رات کے وقت شاید آٹھ نو بجے ہردوار اسٹیشن پر گاڑی پہنچی یوں تو متعدد بار ہردوار کے اسٹیشن سے گذر چکا تھا، یہ تو دیکھتا تھا کہ کافی ہجوم اس اسٹیشن پر ہوتا ہے۔ لیکن جب اُترنے کی نیت سے میں نے بھی بستر لپیٹ کر پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو کان میں ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر صوبے کے ہر ضلع کی آواز گونجنے لگی۔ پکارنے والے ان ہی علاقوں کا نام لیتے تھے۔ اور سمٹ سمٹ کر مسافروں کی ٹولی، مختلف پکارنے والوں پر جمع ہو رہی تھی، آخر یہ قصہ کیا ہے، پتہ چلا، کہ

ہر دوار کے پنڈے ہیں، سارا ہندوستان ان پر بٹا ہوا ہے، ملک کا جو علاقہ جس کے حصّہ میں آیا ہے، اُس ضلع کے رہنے والے تیرتھی اُسی کے خاص حجمان ہیں، وہی ان کو اپنے ساتھ لیجائیں گے۔ گویا انکی حیثیت بلا تشبیہ غالباً وہی ہے جو مطوفین کی ہوتی ہے، اور مکہ معظمہ میں جس کا تجربہ پہلے ہوتا تھا۔ اب تو سعودی حکومت نے تقسیم کے اس قصّہ کو ختم کر دیا ہے، ورنہ سُنا ہے کہ ہندوستان ہی کو نہیں ساری اسلامی دُنیا کو مکہ معظمہ کے مطوفوں نے باخود اطور پر بانٹ لیا تھا ممکن نہ تھا کہ ان کے علاقے کا حاجی دوسرے مطوف[1] کے پاس چلا جائے۔

بہر حال دس پندرہ منٹ میں تقسیم و توزیع کا یہ سارا کاروبار ختم ہو گیا اپنے اپنے مملوکہ علاقوں کے حجمانوں کو پنڈے اپنے ساتھ لے گئے۔ ابتداء میں میری طرف بھی کوئی صاحب یہ پوچھتے ہوئے بڑھے کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ لیکن جواب میں یہ سُنکر کہ "بندہ تو مسلمان ہے" سر جھکائے وہ واپس ہو گئے، اسٹیشن خالی ہو گیا۔ جہاں اتنا بڑا ہجوم تھا، وہاں ہُو کا عالم قائم ہو گیا۔ اسٹیشن کے چند ملازمین کے سوا کوئی باقی نہ رہا۔ مگر ایک میں ہی جو کسی کام کا نہ تھا۔ گاڑی روانہ ہو چکی تھی، واپسی کا موقعہ بھی باقی نہ تھا۔ اب تو بہر حال رات ہر دوار ہی میں گذارنی ہے، طے کر کے بستر ے کو بغل میں دبائے، اسٹیشن سے باہر نکلا، سامنے ایک لمبی چوڑی عمارت تھی، معلوم ہوا کہ سرا ہے جس میں مسافر ٹھیرتے ہیں دل خوش ہوا رات اسی میں بسر ہو جائے گی۔ لیکن جو منگلور میں مسجد سے دھکا دکر نکال دیا گیا تھا، اُسی کے ساتھ دیکھیے دیر میں کیا صورت حال پیش آئی

یہ شعر تو اُس وقت نظر سے نہیں گزرا تھا، لیکن شاید حال یہی تھا کہ ؎

اے برہمن بار دہ رد کردۂ اسلام را
یا چو من گمراہ را در بتکدہ ہمراہ نیست؟

قسمت کی خوبی ملاحظہ فرمائیے کہ یہاں سے بھی وہ در در اہی دیا گیا۔ جوں ہی سرا کے دروازے پر پہونچا، دربان تھا، یا کون تھا، اُس نے درشت لہجہ میں کہا کہ "آپ لوگوں کے لئے اس سرا میں کوئی جگہ نہیں" مولویت کو تو چھُپا بھی سکتا تھا لیکن اسلامی علامات پھر بھی چہرے سے پھُوٹے پڑتے تھے۔ اب کیا کروں۔ اُلٹے پاؤں پھر اسٹیشن ہی کی طرف لوٹ آیا۔ اسٹیشن میں پہلے سے زیادہ سناٹا تھا، لوگ اپنی اپنی آرامگاہوں میں جا چکے تھے۔ گرمی بلکہ برسات والی گرمی اس کے ساتھ تھی۔ اسٹیشن کے اندر دل سونے پر راضی نہوا۔ آج خیال آتا ہے۔ اپنی اس بے تکلفی اور جسارت کا کہ بغیر کسی وسوسہ اور دغدغہ کے بستر اکھول اسٹیشن کے احاطہ ہی میں غالباً کسی درخت کے نیچے شطرنجی بچھا، تکیہ سر ہانے رکھ نماز پڑھنے کے بعد سو گیا۔ اور رات بھر سوتا رہا، کسی نے چھیڑا نہیں، یہ تو خیر اب بھی ممکن ہے۔ لیکن دل میں میرے کسی قسم کا کوئی خیال نہ آیا، حیرت اس پر ہو رہی ہے۔

صبح ہوئی اسٹیشن ہی پر پانی بھی مل گیا، اور درخت کے نیچے بستر ے ہی پر جانماز بچھا کر صبح کے دوگانہ سے فارغ ہوا، بستر ے کو لپیٹ کر بغل میں دبائے پھر اسی سرا کے دروازے پر پہونچا جس سے نکالا گیا تھا۔ خیال یہ ہوا کہ کچھ نہیں تو بستر ے کے بوجھ سے تو نجات حاصل کر لینی چاہیے، اس وبالِ بغل سے جو عنقریب وبالِ دوش بننے والا تھا، اس سے نجات کی صورت یہی سمجھ میں آئی، کہ سرا کے اسی دربان سے بہ لجاجت تمام و سماجت با احترام کے ساتھ عرض کیا جائے کہ کچھ نہیں بھائی تو میرے بستر ے کو تو آپ اس سرا میں جگہ دے سکتے ہیں، بندھا ہوا ہے کسی جگہ ڈال دیجئے۔ اور جو کرایہ فرمائیے گا، ادا کر دوں گا کچھ سوال و جواب کے بعد آخر بے چارہ آدمی تھا، نرم پڑ گیا، اور بستر ے کے رکھ لینے پر راضی ہو گیا۔ غالباً دو آنے چوبیس گھنٹے کے لئے کرایہ

---

[1] باوجود تلاش اور جستجو کے ابتک اس کا پتہ نہ چلا کہ مکہ معظمہ میں مطوفوں کا یہ طبقہ کب پایا جاتا ہے، کتابوں میں اس کی تاریخی حیثیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے یا کم از کم میری نظر سے اب تک کوئی کتاب ایسی نہیں گذری ہے جس میں تشفی بخش جواب اس سوال کا دیا گیا ہو۔ اسلام سے پہلے جو معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے رہنے والے آنے والے حجاج کی راحت و آسائش، خورد و نوش کا نظم اپنی طرف سے کرتے تھے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسکا کوئی معاوضہ حجاج سے نہیں لیتے تھے بلکہ قریش کے خاندانوں میں مقابلہ ہوتا تھا کہ حجاج کی خدمت میں کون سبقت لیجاتا ہے، اسلام کے بعد مکہ کے شرفاء کا بسط و تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہو لیکن مطوفیت بطور روزگار اور پیشہ کے لوگوں نے کب اختیار کیا، اسکا پتہ نہیں چلتا۔ کبھی کبھی یہ وہم ہوتا ہے کہ ہندوستان ہی کی ریس میں تو اس سلسلہ کا آغاز کہیں نہ ہوا ہو مطوفوں کے جو خاندان آجکل مکہ میں پائے جاتے ہیں تحقیق سے معلوم ہوا کہ اُن میں کافی تعداد اُن لوگوں کی ہے جن کے آباء و اجداد ہندوستان ہی سے مکہ معظمہ پہنچے تھے، چند پشتوں کے بعد اب وہ م

م عرب معلوم ہوتے ہیں واللہ اعلم
کسی صاحب کو علم ہو، تو اس موضوع پر اپنی معلومات شائع کرائیں۔ ۱۲

بستر سے کے رکھ دینے کا لگایا گیا۔ جو منظور کر لیا گیا۔

اب میں آزاد تھا، ساتھ صرف وہی زادِ راہ (روٹی اور بھرتی والا) رہ گیا، اور طبقات ابن سعد، سفر ایسی کتاب چھوڑنے پر دل راضی ہوا کیا معلوم کہ بستر اداپس بھی ملیگا یا نہیں، بستر سے تو صبر بھی کر سکتا تھا۔ لیکن طبقات ابن سعد کی اس جلد پر صبر کی صورت ہی کیا تھی؟ دھوتی بھی ساتھ رکھ لی گئی تھی، اس میں سب کچھ لپیٹ لیا۔ اور لوگوں سے دریافت کرنے لگا کہ گروکل کانگڑی، جانے کا راستہ کیا ہے؟ تھوڑی دیر بھٹکتا ہی رہا۔ ہردوار میں ایک حصّہ آبادی کا جو دریائے گنگا کے کنارے کنارے دُور تک پھیلا ہوا ہے کنکھل کے نام سے موسوم ہے، اسی آبادی میں دُور تک چلا گیا۔ لوگوں سے پوچھتا کہ میں گروکل، جانا چاہتا ہوں۔ صحیح جواب کوئی نہ دیتا، بہت سے لوگ تو میری اسلامی شکل وصورت کی وجہ سے مُنہ پھیر کر بات کرنے میں بھی محسوس ہوا کہ مضائقہ کر رہے ہیں۔ ایک نیک دل سادھو مزاج آدمی سامنے آیا۔ میری طرف متوجہ ہوا، اور پوچھا کر اُس نے راستے کے سناٹے اتے پتے سے مجھے واقف کیا۔ بولا کہ تم غلط راہ پر پڑ گئے ہو۔ واپس جاؤ، فلاں مقام پر پہونچو، وہاں کشتی جو مسافروں کو گنگا کے پار لیجاتی ہے تم کو ملیگی اُسی پر سوار ہو جانا، پھر آگے یہ ہو وہ ہے۔ الغرض اس غریب انسانیت کے ہمدرد سے جو کچھ بھی ممکن تھا سب ہی کچھ اُس نے کیا۔ پلٹا، اور گھاٹ جہاں کشتی کھڑی ہوئی تھی، پہونچا۔ بہت سے مُسافر اس کشتی میں پار جانے کے لئے تیار تھے۔ اُس پار پہاڑوں، سرسبز پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جس کا زنجیرہ ہمالیہ سے ملجاتا ہے اسی مقام سے کچھ دُور پر پہاڑوں میں گنگا کا سرچشمہ "گنگوتری" ہے۔ مختلف مقامات تیرتھ کرنے والوں کے لئے وہاں پائے جاتے ہیں۔ غالباً چنڈی نامی دیوی کی تیرتھ کے لئے کشتی کے یہ مُسافر گنگا کے اس نالے کو عبور کرکے پار جانا چاہتے تھے۔ میں گنگا کا لفظ استعمال کر رہا ہوں جس کا عرض صوبجات متحدہ اور اس کے بعد بہار تک پہونچتے ہوئے میلوں تک پہونچ جاتا ہے، اسی گنگا کو ہردوار کے اس گھاٹ کے پاس ایک معمولی ندی کی شکل میں میں نے پایا۔ چنڈی دیوی کی تیرتھ کرنیوالے مردوں اور عورتوں کے ساتھ ایک مُسافر گروکل کانگڑی کے ارادے سے کشتی میں بیٹھ گیا۔ کشتی اچھی خاصی لمبی چوڑی تھی۔ مُسافروں کی تعداد بھی کافی تھی، کشتی کھول دی گئی، چند ہی منٹ میں دوسرے ساحل پر گنگا کے اس نالے کے ہم لوگ پہونچ گئے، ہمارے کشتی کے رفیقوں کو جس سمت کی طرف جانا تھا، وہ اس راستے سے مقابل رُخ پر تھا جس پر مجھے جانا تھا۔ ساحل تک سب ساتھ پہونچے لیکن اس کے بعد سب دوسری طرف چل دئے۔ اور تنہا بالکل تنہا کچھ دیر تو ساحل پر کھڑا دیکھتا رہا کہ شائد مجھے بھی کوئی رفیقِ سفر مل جائے لیکن جس راہ پر مجھے چلنا تھا، اس پر جانے والا اُن میں کوئی بھی نہ تھا۔ کشتی والے بھی اپنی کشتی کو لے کر مسافروں کو اُتار کر واپس ہو گئے۔ بتا دیا گیا تھا کہ سامنے جو گھنا جنگل نظر آتا ہے، اسی میں ایک پگڈنڈی ملے گی، اسی پگڈنڈی پر چلے چلنا گروکل پہونچ جاؤ گے۔

اللہ کا نام لیکر تنِ تنہا اسی جنگل میں گھُسا، غالباً یہاں میں نے لنگی کہئیے یا دھوتی باندھ لی، پائجامہ اُتار دیا۔ زادِ راہ اور کتاب والی گٹھری بغل میں تھی۔ اسی شان کے ساتھ جنگل کی اس پگڈنڈی پر چل پڑا، جو بہت جلد مل گئی، وقت غالباً آٹھ ساڑھے آٹھ بجے دن کا تھا۔ سر جھکائے اسی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ پانی کا ایک نالہ سامنے آیا اس نالہ کے مقابلہ میں جس سے بذریعہ کشتی ہم پار ہوئے تھے، یہ نالہ چھوٹا اور بہت چھوٹا تھا۔ جوتے اُتار لئے گئے، اور گٹھری کے ساتھ جوتوں کو بھی بغل میں دبائے نالے میں پاؤں رکھا، اناللہ وانا الیہ راجعون پانی کاہے کو تھا۔ پگھلی ہوئی برف تھی جو پانی کی شکل میں بہہ رہی تھی، خیر جوں توں کرکے اس ٹھنڈک سے تو قطع نظر کر لیا۔ لیکن اب دیکھتا ہوں کہ قدم جہاں پر رکھتا ہوں وہیں سے وہ پھسل جاتا ہے، یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ پانی بھی ہمالیہ کی پگھلی ہوئی شاید برف ہے، اور پہاڑوں سے چھوٹے بڑے ٹکڑے پانی کے ساتھ بہہ بہہ کر نامعلوم زمانے سے اس نالے میں بچھ گئے ہیں، ان پر کائی بھی جمی ہوئی ہے، اور پانی کے بہاؤ نے اُن تمام ٹکڑوں کو گول گول پتھروں کی شکل میں بدل دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے چکنے سپاٹ کائی لگے ہوئے ٹکڑوں پر قدم کا جمانا آسان نہ تھا۔ کبھی اِدھر جھکتا کبھی اُدھر گرتا، تاہم کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اُس نالے سے تو پار ہو گیا

کچھ دور پھر خشکی ہی میں چلا کر پھر وہی برفیلے اور پتھریلے نالے کو اپنے سامنے پاتا ہوں، غالباً دو ایک نالوں سے گذرا تھا، اور جنگل والی پگ ڈنڈی پر چل رہا تھا، کہ اچانک ہو کے اسی عالم میں آہٹ سی محسوس ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جدھر میں جا رہا ہوں اُسی طرف سے کوئی آدمی میری طرف آ رہا ہے، اُس سے کچھ ڈھارس بندھی، آہٹ کے ساتھ ہی دیکھا کہ واقعی ایک پیر مرد جس کی داڑھی بھی تھی، اور اکثر بال اُس کے سپید تھے، سامنے سے آ رہے ہیں۔ بہت جلد میرے قریب وہ آ گئے، وہ بھی دھوتی اور کُرتے ہی میں تھے۔ میں نے ان کو دیکھا انہوں نے مجھ کو، اسی کے ساتھ "السلام علیکم" کے ساتھ پیش قدمی ان کی طرف سے ہوئی، قلب کا سکون بشاشت سے بدل گیا۔ مصافحہ کی نوبت بھی شائد آئی۔ اس کے بعد دیکھا کہ وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں "میاں صاحبزادے کدھر جا رہے ہو۔ کہاں کے ارادے ہیں؟" میں نے عرض کیا کہ "اسی جنگل میں سُنتا ہے کہ کوئی مدرسہ "گروکل" نامی ہے اسی کو دیکھنے کے لئے جا رہا ہوں"۔ بولے "تو اس کے لئے برسات کے موسم کا تم نے انتخاب کیا اور وہ بھی اکیلے تنِ تنہا جا رہے ہو۔" اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا، کہ "صورت حال۔۔۔ تو یہی پیش آ گئی ہے" پھر میری پیٹھ پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے بولے کہ "خیر تم نے بڑی جرأت سے کام لیا، اب تو آ چکے ہو، چلو تمہیں وہاں تک میں پہونچا آؤں، خدا جانے تم کدھر بھٹک جاؤ گے۔" یہ کہتے ہوئے میرے ساتھ بے چارے پلٹ پڑے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے چلتے رہے۔ گروکل کب سے قائم ہوا ہے، کیوں قائم ہوا، یہاں کیا کیا ہوتا ہے؟ کچھ اسی قسم کی باتیں وہ مجھ سے کرتے رہے۔ اِس کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس پیر مرد سے پوچھوں کہ آپ آخر کون ہیں؟ کہاں کے ہیں؟ اپنی باتوں میں مجھے اُلجھا رکھا تھا اِس کا شائد موقعہ ہی پیدا ہونے نہ دیا۔ اسی حال میں ہم دونوں پھر اُسی برفیلے پتھریلے نالوں میں سے کسی نالے پر پہونچے، معلوم ہوا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر یہ نالے مسلسل اس راستے میں ملتے چلے جاتے ہیں، نالے کے قریب جب ہم دونوں پہونچے، تو پیر مرد نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ کھانے پینے کی بھی کوئی چیز ہے؟ روٹیاں اور آلو کے بھرتے کا پیالہ ساتھ تھا، اسی کی طرف اِشارہ کر دیا۔ بولے "تو پھر جاؤ

ایک درخت کی چھاؤں میں چکنی چٹان پر مجھے بٹھا دیا، اور تمام لوٹ جو میرے پاس تھا، اُس کو لے کر نیچے اُترے، نالے کے بہتے ہوئے ٹھنڈے پانی سے اُس کو بھر کر لائے، واقعی پانی صاف وشفاف تھا۔ پھر اپنے رومال سے دیکھا کہ انہوں نے بھی چند روٹیاں نکالیں، جن کے بیچ میں ماش کی دال تھی۔ رومال بچھا کر اپنے اور میرے زادراہ سے اسی جنگل میں انہوں نے خوانِ نعمت چن دیا۔ ٹھنڈا پانی، بھوک کے ساتھ غذا کی لذت جو اُس وقت کام ودہن نے محسوس کی شاید یہ کیفیت کبھی زندگی میں میسّر آئی ہو۔ مشفقانہ طریقے سے کھلاتے جاتے تھے، خود بھی ایک دو لقمے لیتے۔ کہتے کہ "میاں کھالو خدا جانے تمہیں کھانا دانا ملے بھی یا نہیں۔"

کھانا ختم ہو گیا۔ دونوں آگے چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ نالے میں پاؤں رکھا، وہی پھسلاؤ کا قصہ شروع ہوا، کچھ تدبیریں جوان صاحب کو معلوم تھیں، غالباً سکھائی گئیں، اور ہم نالے کے پار ہو گئے۔

(باقی باقی)

(بقیہ صفحہ ۳۷ کا مضمون)

کیونکہ اس کے باوجود کہ پہلے سارے صحابہؓ اجماعاً اس جہاد کے خلاف تھے حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کے اجماع کا کچھ اعتبار نہ کیا اور عمل اسی پر کیا جو نصوص صریحہ کا قطعی اقتضا تھا نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ وقتی اجماع کو شرعی اجماع کا درجہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ اہل حل وعقد اسی پر قائم اور ثابت رہیں۔

(۹) اس اختلاف شیخین سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح حضرت فاروق اعظمؓ کو باوجود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سفر وحضر اور وطن وہجرت کا ساتھی ہونے کے آپ کے ایک ارشاد پر اطلاع نہ ہوئی، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات احادیث بھی بعض دیگر اکابر سے مخفی رہیں اور حضرت صدیق اکبرؓ کو ان پر اطلاع ہو چکی ہو یعنی اتنے قُرب وتعلق کے باوجود بعض اکابر پر بعض روایات کا مخفی رہنا مستبعد نہیں ہے جیسے کہ انبیاء کی مالی وراثت نہ ہونے کی حدیث کا علم حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کو بھی حضرت صدیق اکبرؓ کے بتلانے سے ہی ہوا نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کمالات علمیہ میں حضرت صدیقؓ تمام صحابہ پر فائق تھے۔

(۱۰) اس اختلاف شیخین سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مجتہد کے لئے دوسرے مجتہد کی تقلید جائز نہیں اور ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اجتہاد میں ایک دوسرے کی متابعت صرف اسی صورت میں کریں کہ دلائل کی رُو سے اُن کا اطمینان ہو چکا ہو۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہ

تنقید و تبصرہ

(سیّد محمّد ازھر شاہ قیصر)

جدید نصاب کی کتابیں!

اردو عربی قاعدہ - صفحات ۵۶ - قیمت پانچ آنے ۵؍

دینی تعلیم کا پہلا رسالہ 〃 ۴۰ 〃 چار آنے ۴؍

دینی تعلیم کا دوسرا رسالہ (حصّہ اوّل و دوم) صفحات ۹۶ 〃 سات آنے ۷؍

دینی تعلیم کا تیسرا رسالہ (حصّہ اوّل و دوم) 〃 ۱۱۲ 〃 آٹھ آنے ۸؍

دینی تعلیم کا چوتھا رسالہ (〃 〃) 〃 ۳۲۰ 〃 عہ؍

دینی تعلیم کا پانچواں رسالہ (〃 〃) 〃 ۳۶۸ 〃 عـہ؍

طریقۂ تعلیم (〃 〃) 〃 ۵۶ 〃 پانچ آنے ۵؍

مُلک کی تقسیم اور سیکولر حکومت کے قیام کے بعد ہندوستان میں مُسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور دینی ضرورتیں شاخ در شاخ بنکر پھیل گئی ہیں، جمعیتہ علماء ہند اپنی قوت، تدبیر و عمل سے ان اُلجھے ہوئے مسائل کو حل اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہر محاذ اور ہر موقعہ پر پوری مستعدی کے ساتھ مصروف عمل ہے۔ لازمی تعلیم کے نفاذ کے بعد چونکہ سرکاری مدارس اور اسکولوں میں مسلمانوں کے لئے دینی تعلیم کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے، اس لئے اس نے ضرورت محسوس کی کہ ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے جو طوالت و صعوبت سے بری اور مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ ضرورتوں کے لئے کارآمد ہو سکے۔ اسلامی مدارس اور بعض اور اداروں نے بھی وقتاً فوقتاً بچوں کے لئے نصاب تیار کئے ہیں مگر بحالات موجودہ وہ نصاب کارآمد ثابت نہیں ہو سکے۔ جمعیۃ علماء کی مقررکردہ تعلیمی کمیٹی نے اپنے اس نصاب میں مقتضیات زمانہ کو سامنے رکھ کر کئی ضروری چیزوں کا التزام کیا ہے:-

(۱) عام طور پر مذہب کو صرف عقائد و عبادات میں منحصر سمجھ کر دینیات میں صرف ان دو چیزوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نصاب میں بچّے کے دماغ میں اسلام کی ہمہ گیری کا صحیح نقشہ قائم کرنے کے لئے اخلاق اور اسلامی تہذیب کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔

(۲) کوشش کی گئی ہے کہ تھوڑے سے تھوڑے وقت میں غیر معمولی محنت کے بغیر مسلمان بچّے کی ذہنی تربیت صحیح اسلامی اُصولوں کی جا سکے اور اس کے ذہن کو اسلامی آثار و تعلیمات پر اتنا پختہ کر دیا جائے کہ غیر اثرات اسے کسی لغزش میں نہ ڈال سکیں۔ چنانچہ ان سب کتابوں میں ان پانچ مضامین کو لازمی جزو کی حیثیت دی گئی ہے یعنی عقائد، سیرت پاک، عبادات، اسلامی اخلاق، اسلامی تہذیب و آداب معاشرت۔ اور یہ جز مجموعہ ہیں جن پر کسی انسان کی ذہنی اور عملی تربیت کا مدار ہے اگر انسانی ذہنیت کو صحیح طور پر یہ اجزاء فراہم کردئے جائیں تو اس کی تکمیل و تربیت میں کوئی کمی نہیں رہ جاتی۔

(۳) عقائد و عبادات کی تعلیم پر زور دینے کے ساتھ یہ بھی ضروری سمجھا گیا ہے کہ خورد و نوش، آمد و رفت، گفتگو، پہلی ملاقات، رہائش پوشش انسانی تہذیب کے ان سب گوشوں پر بھی صحیح تعلیم دیجائے تاکہ زندگی کے عام معاملات میں مسلمانوں کی آئندہ نسلیں دوسرے غیر کی طرف نظریں جمانے کی ضرورت محسوس نہ کریں اور انہیں اپنی ضروریات زندگی کے لئے اپنے مذہب کا دائرہ تنگ نظر نہ آئے۔

(۴) اُردو زبان کی حفاظت کا بھی خیال رکھا گیا ہے، اس نصاب کو پڑھ لینے کے بعد ایک بچّہ اُردو کی کافی قابلیت پیدا کر سکتا ہے ان التزامات کے ساتھ نصاب جدید کی یہ پانچ کتابیں تیار کی گئی ہیں "طریقۂ تعلیم" کے نام سے ایک رسالہ میں اساتذہ کو ایسی ہدایات دی گئی ہیں جنہیں سامنے رکھ کر وہ نونہالانِ اسلام کی تربیت ذہنی اور

تعلیم دینی کے فرائض سے بڑی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ یہ مختصر سا رسالہ معلموں کے لئے بہترین معلم اور اساتذہ کے لئے بہترین استاذ ہے آجکل بچوں کو تعلیم دینے اور ان کی تربیت کرنے کے لئے باقاعدہ ٹریننگ دیجاتی ہے اس رسالہ میں اس موضوع سے متعلق اسقدر مواد جمع کر دیا گیا ہے کہ اساتذہ اسکی مدد سے بہترین استاذ اور مربی بن سکتے ہیں۔

دینی تعلیم کے پہلے رسالہ میں نظم و نثر کے دینی، اخلاقی اور تہذیبی نہایت ہلکے پھلکے مضامین جمع کئے گئے ہیں عربی اور اردو کے رسم الخطوں سے بچوں کو مانوس کرنے کے لئے دونوں خطوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

دینی تعلیم کے دوسرے رسالہ (حصہ اول و دوم) میں بچوں کی دماغی استعداد کو سامنے رکھکر سادہ اور آسان زبان میں تعلیم دی گئی ہے۔

تیسرے رسالہ میں عقیدۂ توحید، صفات باری، انبیاء، الہامی کتابوں، حضور کی سیرت پاک عبادات و معاملات اور اخلاق و تہذیب کا بیان ہے اور طویل تعلیمی تجربہ کے ساتھ اس کی کامیاب کوشش کی گئی ہے کہ یہ مضامین بچوں کے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں، انداز بیان بہت سادہ ہے اور بڑے بڑے مسائل کو مختصر اور دلنشین الفاظ میں سمیٹ لیا گیا ہے۔

چوتھے رسالہ میں اسلامی تعلیمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی تشریح کی گئی ہے حضور صلعم جن غزوات میں شریک ہوئے انکے اغراض و اسباب کی تفصیل بیان کی گئی ہے عبادات میں نماز اور اسکے ارکان و فرائض پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عبادات سے گذر کر اخلاق کے عملی گوشوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

ساری کتابوں میں ہر سبق سے پہلے، سبق میں مذکور خاص خاص الفاظ کی فہرست دی گئی ہے تاکہ طالب علم انکو اور ان کے معانی کو محفوظ رکھ سکے، ہر سبق کے اخیر میں سوالات قائم کر کے پورے سبق کو بچے کے ذہن نشین کرا دیا گیا ہے۔

دینی تعلیم کے دوسرے رسالہ میں عبادات کی تشریح کرتے ہوئے "پوجا" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے تسہیل اردو کے پیش نظر اگرچہ ایسے الفاظ قابل اعتراض نہ ہوں مگر ہماری خواہش ہے کہ کم از کم عبادات اور دینیات کی تفسیر میں ایسے الفاظ نہ لائے جائیں ہمنے پوری توجہ کے ساتھ نصاب جدید کی ان کتابوں کا مطالعہ کیا اور انھیں مسلمانوں کی موجودہ ضرورتوں کیلئے کارآمد اور موجودہ حالات میں ان کے لئے بیحد نفع بخش پایا ہم جمعیۃ علماء کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس نے اپنی محنت اور فرض شناسی سے مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو محفوظ رکھنے کیلئے بڑی خدمت انجام دی۔ لازمی تعلیم کے نئے نظام نے اگر سرکاری مدارس کی فضا کو مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے سم تاریک بنادیا تھا تو جمعیۃ کے اس نصاب نے خالص تعمیری شکل میں اس کے لئے روشنی مہیا کر دی۔

(سید محمد ازہر شاہ قیصر)

ادبیات

نغمۂ زنداں کُشا

مجھے بزمِ خوب کہے تو کیا، مجھے دادِ شعر ملے تو کیا؟
یہ کرشمۂ غمِ دوست ہے مری شاعری کا ہُنر نہیں

(حضرت احسان دانش کاندھلوی)

بزم میں جب وہ وفا نا آشنا بھی آئے گا — کیوں نہ آئے عشق کے لب پر گلہ بھی آئے گا
زندگانی کے حقائق کی طرف دعوت تو دے — آشنا بھی آئے گا نا آشنا بھی آئے گا
تہ نشیں ہو موجۂ طوفاں کا دامن چھوڑ کر — خود بخود کشتی ڈبو کر ناخُدا بھی آئے گا
رُوحِ گلشن خاک کے ذرّوں میں لیکی کروٹیں — اِک امامِ وقت اس انداز کا بھی آئے گا
ہو گئے جُرمِ جنوں میں جتنے دیوانے اسیر — اُن کے لب پر نعرۂ زنداں کُشا بھی آئے گا
دار و زنداں کے پرستارو یوں ہی ہنستے رہو — آئے گا دورِ مکافاتِ جفا بھی آئے گا
تشنگی در تشنگی ہے اور سراب اندر سراب — جانے ان راہوں میں کوئی نقشِ پا بھی آئے گا؟
عشق کی مظلوم خاموشی نہ خالی جائے گی — حُسن پر اک وقتِ احساسِ جفا بھی آئے گا
آپ کے جلوے سلامت آپ کے ہوتے ہوئے — کیا مرے دل میں خیالِ ماسوا بھی آئے گا؟
کب تک ان اُجلے اندھیروں کی قیادت میں سفر — کوئی تارا چرخ پر منزل نُما بھی آئے گا؟
جو دعا نکلے گی دل سے کیوں نہ ہو گی مستجاب — جب کوئی بندہ پکارے گا خُدا بھی آئے گا
پہلے اپنے دست و بازو پر تو کرلے اعتماد — پھر مرا ذمّہ تعاون کو خُدا بھی آئے گا
گھر میں بیٹھے گُمرہی کا شکوہ بیجا نہ کر — رہروؤں کو جمع کرلے رہنما بھی آئے گا

بانی ہونے کی سعادت

زندگی میں یہ جنازوں کی پرستش تابکے
[illegible] دورِ احسان حسبِ مدّعا بھی آئے گا

دسمبر ۱۹۵۳ء
دارالعلوم دیوبند